باب 6

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ فَاِنۡ تَوَلَّیۡتُمۡ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوۡلِنَا الۡبَلٰغُ الۡمُبِیۡنُ

خطباتِ نظیریہ

غوث المعظم رہبر اعظم طریقت نسبت رسولی ﷺ

اعلیٰ حضرت الحاج پیر **نظیر احمد** رحمۃ اللہ علیہ

المعروف بہ سرکار موہڑویؒ

دربارِ عالیہ موہڑہ شریف۔ تحصیل مری۔ ضلع راولپنڈی

پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

1	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف 22 دسمبر 1951ء	303
2	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف 22 جولائی 1952ء	314
3	خطبہ ایک مجلس۔اگست 1953ء	320
4	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف 20 جون 1954ء	322
5	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف 21 نومبر 1954ء	327
6	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف نومبر 1955ء	330
7	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف جون 1959ء	354
8	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف نومبر 1959ء	356
9	خطبہ مجلس کبریٰ۔عرس شریف 25 جون 1960ء	358

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ مجلس کبریٰ

عرس مبارک 22 دسمبر 1951ء

کئی ہزار مریدین کی حاضری کے وقت منجانب علمائے پاکستان مولانا صوفی غلام محمد صاحب سکنہ پڑانگ تحصیل چارسدہ ضلع پشاور نے مندرجہ ذیل سوالات پیش کئے اور ان کے جوابات کی استدعا کی۔ اعلیٰ حضرتؒ نے بالاختصار جو جوابات عنایت فرمائے وہ درج ذیل ہیں۔

سوالات

1۔ شریعت، طریقت اور معرفت کس مدعا کے لفظ ہیں ان کی اصلیت کی تشریح فرمائی جائے؟

2۔ عبادت کونسی افضل ہے؟

3۔ ذکر کی حقیقت کیا ہے؟

4۔ ولایت اور ولی ہونا، اولیاء بننا اس کی کیا حقیقت ہے؟

5۔ کس ولی اور کس پیر سے بیعت ہونا چاہیے؟

6۔ بیعت ہونا یہ کیا کاروائی ہے۔ اس کے متعلق حکم سنایا جائے؟

7۔ کشف و کرامات اور معجزہ کیا چیزیں ہیں؟

8۔ عرس کیا چیز ہے؟ اس کا مدعا کیا ہے اور اس کا ثبوت کیا ہے؟

9۔ شغلِ طریقت و سلوک مسلمانوں میں کیا زیادتی پیدا کرتا ہے؟

10۔ غوث، قطب کیا ہے وضاحت فرمائی جائے؟

جوابات

اعلیٰ حضرتؒ نے اپنے خطاب میں فرمایا: حاضرین! ایک دن ایسا آنے والا ہے کہ میں اور تم یعنی ہم سب خداوند کریم کے دربار میں پیش ہوں گے۔ قرآن مجید اس خبر سے لبریز ہے۔

يَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَيۡرَ الۡاَرۡضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوۡا لِلّٰهِ الۡوَاحِدِ الۡقَهَّارِ ۝ وَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ يَوۡمَئِذٍ مُّقَرَّنِيۡنَ فِى الۡاَصۡفَادِ ۝ سَرَابِيۡلُهُمۡ مِّنۡ قَطِرَانٍ وَّتَغۡشٰى وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ ۝ لِيَجۡزِىَ اللّٰهُ كُلَّ نَفۡسٍ مَّا كَسَبَتۡ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ ﴿ابراهیم: 51-48﴾

''جس دن یہ زمین دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی بدل دیے جائیں گے اور سب لوگ خدائے یگانہ وزبردست کے سامنے نکل کھڑے ہوں گے اور اس دن تم گنہگاروں کو دیکھو گے کہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں ان کے کرتے گندھک کے ہوں گے، اور ان کے مونہوں کو آگ لپٹ رہی ہوگی ، یہ اس لئے کہ خدا ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ دے۔ بیشک خدا جلد حساب لینے والا ہے''

اِس وقت خداوند کریم حاضر و ناظر ہے۔ ہم حاضر ہیں خداوند کریم نے دنیا کو پیدا فرمایا اور اس میں انسان جیسے ذی عقل کو پیدا کیا اور پھر انسان کو شرافت بخشی۔

وَلَقَدۡ كَرَّمۡنَا بَنِىۡۤ اٰدَمَ ﴿بنی اسرآءیل :70﴾

''اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی''

اور اس خطاب کے ذریعے اُسے دیگر مخلوقات پر برتری بخشی۔

خداوند کریم نے اپنی امانت کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن انہوں نے معذرت چاہی اور اس ذمہ داری کے متحمل نہ ہوسکے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّا عَرَضۡنَا الۡاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَالۡجِبَالِ فَاَبَيۡنَ اَنۡ يَّحۡمِلۡنَهَا وَاَشۡفَقۡنَ مِنۡهَا وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا ﴿الاحزاب:72﴾

''ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا بے شک وہ ظالم اور بڑا نادان ہے''

انسان ہی نے اس امانت کو قبول کیا باوجودیکہ اس کی عاقبت سے بے خبر تھا اس امانت یا ہدایت کا نام ہدایت الٰہی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَاهُمْ یَحْزَنُوْنَ﴿البقرة:38﴾

''جب تمہارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے تو (اس کی پیروی کرنا کہ) جنہوں نے میری ہدایت کی پیروی کی۔ ان کو نہ کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمناک ہوں گے''

اس ہدایت واحکام الٰہی کا نام شریعت ہے۔

شریعت

دنیا کے اندر عالم خلق میں انسان پاکیزگی اور اچھے طریقہ سے بمطابق احکامِ خداوندی، رضائے الٰہی کے حصول کیلئے اپنی زندگی گزارے۔ اس کا نام شریعت ہے۔

طریقت

یہ لفظ کل ہے اس سے شریعت مقدم ہے جو شخص شریعت سے واقف نہ ہو وہ طریقت نہیں سمجھ سکتا اس لئے فرائض و واجبات جو شریعت میں ذکر کئے گئے ہیں پہلے جان لے اور شریعت کے اتباع کے ساتھ جب انسان محض رضائے الٰہی کی خاطر خلوصِ قلب سے احکام خداوندی اور ذکر الٰہی میں مشغول ہو جائے تو طریقت کے دروازہ میں قدم رکھتا ہے یہ طریقت ہے۔ طریقت میں داخل ہونے کے بعد جب ذرا سا پردہ کھل جاتا ہے تو اسے'' **انبساط یا بسط**' کہتے ہیں اس وقت انسان بہت خوش ہوتا ہے۔ بخلاف اس کے اگر دل میں تنگی اور خفقان طاری ہو جائے اس کو''قبض'' کہا جاتا ہے۔ قبض دور کرنے کا علاج شیخ طریقت کی توجہ ہے۔

معرفت

معرفت بذات خود کچھ چیز نہیں تاہم اچھی چیز ہے جس کیلئے عارف اور معروف دونوں لازم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی معرفت کا کسی کو علم حاصل نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کی پہچان اس کی صفتوں اور اس کے اسماء سے ہے۔ مثلاً خالق اسم میں صفت خلق ہے یا رزّاق اس میں صفت رزاقیت کی ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ کی معرفت بذریعہ صفات ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

تَفَكَّرُوا فِيْ صِفَاتِهٖ وَلَا تَفَكَّرُوْا فِيْ ذَاتِهٖ

''اللہ تعالیٰ کی صفات میں سوچ و بچار کرو اور اس کی ذات میں نہ سوچو''

جس طرح اللہ تعالیٰ قدیم ہے اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور خدا تعالیٰ کی جملہ صفات کا سوائے باری تعالیٰ کے اور کسی پر اطلاق نہیں ہوتا۔ المختصر''شریعت'' اقوال وافعال،''طریقت'' اخلاق واحوال اور''معرفت'' علم ویقین ہے۔

سوال دوئم: عبادت کونسی افضل ہے؟

جواب: خداوند کریم کا ذکر وفکر اس ہیئت سے کرنا جو رسول کریم ﷺ نے امت کو فرمایا ہے۔

اَلا اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَا الْجَسَدُ كُلُّهُ اَلا وَهِيَ الْقَلْبُ ﴿الحدیث﴾

''بے شک انسان کے جسم میں خون کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ سدھر گیا تو سارا جسم سدھر گیا اور جب وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا خبردار وہ قلب ہے''

جب انسانی قلب آلودگیِ دُنیا سے متنفر ہوتا ہے اور اچھی اچھی صفات اس میں متمکن ہو جاتی ہیں تو اس تمکن اوصاف حمیدہ سے اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اس اطمینان کو اصطلاح سلوک میں نسبت کہتے ہیں اور ایسی حالت میں جو عبادت بموجب حدیث مبارک

اَنْ تَعْبُدُ اللّٰهَ (رَبَّکَ) كَاَنَّکَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاکَ ﴿بخاری و مسلم﴾

''تو اللہ کی عبادت یوں کر کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے جو یوں نہ کر سکے تو ایسا ہو کہ گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے''

اگر ایسی کیفیت ہو تو وہی افضل عبادت ہے۔ عبادت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک درخت ہو جس میں پھول، پتے اور ٹہنیاں ہوں۔ یہ پھول، پتے اور ٹہنیاں جس قدر خوبصورت ہوں گے اسی قدر درخت بھی خوبصورت ہو گا۔ اسی طرح عبادت اگر خضوع و خشوع، عاجزی اور انکساری سے کی جائے تو عنداللہ مقبول اور منظور ہوگی بشرطیکہ کپڑے اور کھانا حرام سے ملوث نہ ہوں کیونکہ حرام ہی ایک ایسی چیز ہے جو کہ عبادت کو دربار خداوندی میں جانے نہیں دیتا اور نماز یا عبادت واپس عابد کے منہ پر ماری جاتی ہے۔ دیگر وہ عبادت افضل ہے جس میں ریا کا شائبہ نہ ہو جس عبادت میں ریا ہوتی ہے اس کے متعلق قرآن پاک میں وعید ہے۔

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ اَلَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ﴿الماعون: 4,5,6﴾

''تو ایسے نمازیوں کی خرابی ہے جو نماز کی طرف سے غافل رہتے ہیں جو ریاکاری کرتے ہیں''

سوال سوئم: ذکر کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: جو یادِ الٰہی ضمیر میں ہو اور ایسی حالت میں ہو کہ قلب کو **من کل الوجوہ امورِ دنیا** سے فارغ کر کے اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ اسی بارے میں ارشاد ربانی ہے:

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ﴿الاعراف: 205﴾

''اور اپنے پروردگار کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے اور پست آواز سے صبح وشام یاد کرتے رہو اور اس کی یاد سے غافل نہ ہونا''

ذکر الٰہی دو قسم کا ہے ایک وہ ذکر جو جہر سے کیا جائے یہ ذکر منع نہیں بشرطیکہ اس کے پاس کوئی نمازی یا فقہ لکھنے والا نہ ہو۔ دوسرا خفی ہے جو بذریعہ سانس ہو جس کا طریقہ ہر ایک مرید کو پیر طریقت بتاتے ہیں یہ افضل طریقہ ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ قیامت کے دن جبکہ ایک بندے کے اعمال ظاہری تولے جائیں گے جو کچھ کراماً کاتبین نے تحریر کیا ہوتا ہے اس وقت جبکہ اس کے نیک اعمال کم ہو جائیں گے اور قریب ہوگا کہ اسے حکم دیا جائے کہ دوزخ میں چلا جائے تو اللہ کی طرف سے فرمان ہوگا کہ اس بندے کے کچھ خفیہ اعمال ہیں جو میرے سوا کوئی نہیں جانتا یہ خاصا اِسی ذات کا ہے اور خاصا وہ چیز ہے کہ **ما يُوْجَد فی فَمِه ولا يوجد فی غيره** اور وہ معرضِ تحریر میں نہیں آ سکتا۔ ان اعمال کے سبب میں نے اس بندے کو بخش دیا ہے وہ یہی ذکرِ خفی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ذکر خفی بہ نسبت ذکر جہری افضل ہے۔ ذکر وہ چیز ہے کہ جب ذاکر ذکر میں پورا پورا مصروف ہو تو ذکر کرتے کرتے اس کی اپنی ہستی ختم ہو جائے اور وہ مذکور میں پہنچ جائے۔

سوال چہارم: ولایت اور ولی ہونا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

جواب: ولی خداوند کریم کے اس مومن بندے کو کہتے ہیں جو **کلاً و جزءً** بہمہ وجوہ الی اللہ متوجہ ہو۔ کمال ایمان، تقویٰ، معرفت اور استقامت شریعت رکھتا ہو جب اس درجہ تک پہنچ جاتا ہے تو خداوند کریم کی طرف سے آسمانوں اور زمین میں منادی ہو جاتی ہے کہ فلاں بندہ میرا مقبول بندہ ہے اور اس کے ساتھ میری محبت ہے اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مرجعِ خلائق بن جاتا ہے۔

سوال پنجم: کس ولی اور پیر سے بیعت ہونا چاہیے؟

جواب: علامات شیخ کامل

صفت اس کی عاجزی ہے۔ اس میں حسد، بغض، کینہ وغیرہ نہیں ہوتا۔ اپنی مجالس میں اولیاء اللہ اور نیک بندوں کو یاد کیا جاتا ہے۔ خداوند کریم اور رسول اکرمﷺ کے احکام لوگوں کو بتلاتا ہے۔ عفو و درگزر کرتا ہے۔ لوگوں کے ساتھ نرمی اور ملاطفت کرتا ہے۔ سلطان الاذکار **خُفْيَةً وَ جَهْرَةً** کرتا ہے جب اس حالت کو پہنچ جاتا ہے تو

اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے فیض واکرام سے سیراب و مالا مال ہو جاتا ہے۔ معارف قدسیہ اس پر ظاہر ہو جاتے ہیں اور فرشتہ با آواز بلند ندا کرتا ہے **ھٰذَا وَ لِیُّ اللّٰہِ وَخَلِیْفَقُہ النَّبِیّ الْمُخْتَارِ** ایسے شیخ طریقت سے بیعت نہایت ہی خوش بختی ہے۔

سوال پنجم و ششم: بیعت ہونا یہ کیا کاروائی ہےاور کس ولی یا پیر سے بیعت ہونا چاہیے؟

جواب: بیعت ہونا یا بیعت کرنا قرآن مجید سے ثابت ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ ج فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ ج وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰھَدَ عَلَیْہُ اللّٰہَ فَسَیُؤْتِیْہِ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿الفتح: 10﴾

''جولوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پھر جو عہد کو توڑے تو عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہے اور جو اس بات کو جس کا اس نے خدا سے عہد کیا ہے پورا کرے تو وہ اسے عنقریب اجر عظیم دے گا''

اور پھر فرمایا:

لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَۃِ فَعَلِمَ مَا فِی قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ﴿الفتح :18﴾

''اے پیغمبر جو مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی''

ان آیات سے بیعت کی اصل ظاہر ہے رسول کریمﷺ نے کبھی تجدید ایمان پر بیعت لی اور کبھی جہاد کے وقت اور کبھی استقامتِ دینِ متین کے بارے میں اور اصلی بیعت وہی ہے جو حدیبیہ میں 6 ہجری میں درخت کے نیچے صحابہ کرامؓ نے رسول کریمﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ وہاں موجود نہ تھے جن کو حضور پاکﷺ نے اشراف قریش کے پاس مکہ معظّمہ بھیجا تھا لہٰذا حضور پاکﷺ نے اپنا بایاں دست مبارک داہنے دست مبارک میں لیا اور فرمایا یہ عثمانؓ کی بیعت ہے اور دعا کی کہ الٰہی عثمانؓ تیرے اور تیرے رسولﷺ کے کام پر ہے اور میں نے اس کی طرف سے بیعت کی۔

بیعت نام ہےاس کاروائی کا جو کہ مرید اپنے آپ کو واصل الی اللہ ہونے کے لئے مرشد کے سامنے پیش کرتا ہے اور مرشد اس مرید کو قبول کر لیتا ہے۔ پھر وہ اپنے جملہ تصرفات پیر کے ہاتھ میں دے دیتا ہے کیونکہ لفظ مرید باب افعال سے ہے اور ہمزہ اس کا سلب ہے یعنی اس مرید کو بعد مرید ہونے کے اپنے ساتھ کوئی تعلق نہیں رہتا بلکہ جملہ امور اپنے مرشد کے حوالے کر دیتا ہے۔

بیعت کے وقت مرشد کو مرید کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا کوئی ضروری نہیں۔ رسول اکرم ﷺ بسا اوقات اس کے بغیر ہی بیعت فرما لیا کرتے تھے اگر مرید کو ایسے ہی توبہ و استغفار کرایا گیا اور سلسلہ میں منسلک ہونے کا عہد لیا گیا تو بھی بیعت ہو گئی۔

بیعت کی چار قسمیں ہیں۔

1۔ بیعت لغو　2۔ بیعت ضلالت　3۔ بیعت سنت　4۔ بیعت فرض

1۔ بیعت لغو

وہ بیعت ہے کہ مرید اور پیر دونوں علم سلوک سے نابلد ہوں اور ایک دوسرے کو تجدید ایمان اور استغفار کیلئے کہے۔

2۔ بیعت ضلالت

وہ بیعت ہے کہ جاہل انسان اپنی ظاہری وضع قطع پیر کی سی بنا کر ایک قوم میں چلا جائے کہ روپیہ، پیسہ اور دنیاوی مفاد حاصل کر لوں گا اور سلوک سے خبر تک نہ ہوا گر مسئلہ مسائل کی ضرورت پیش آئے تو اپنی طرف سے کچھ بتا کر یعنی بلا تحقیق وہ اپنی رائے بتائے وہ خود بھی گمراہ ہو جاتا ہے اور دوسرے عمل کرنے والے بھی گمراہ ہو جاتے ہیں۔

حدیث مبارک میں ہے۔

اِتَّخَذُوْا رَؤُسًا جُھَّالًا فَاَفْتَوْا بِغَیْرِ عِلْمٍ فَضَلُّوْا وَاَضَلُّوْا ﴿الحدیث﴾

''انہوں نے ایسے جاہل چن لئے جو بغیر علم کے باتیں بتاتے ہیں وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا''

3۔ بیعت سنت

یہ وہ بیعت ہے کہ جو پیر طریقہ وسلوک سے واقف ہو اور اس نے مرشد سے بھی بیعت کی ہو اگر ایسے پیر سے موافق طریقہ سنت کے بیعت کی تو یہ بیعتِ سنت ہے اور یہ باعث برکت ہے۔

4۔ بیعت فرض

یہ بیعت وصول الی اللہ کا دروازہ ہے پس جو شخص منازل سلوک طے کرنا چاہے اور وصل باللہ کا طالب ہو تو ایسے مومن کو چاہیے کہ اپنے تمام امور خداوند کریم کے سپرد کرے تو اسے ایسے شیخ کامل سے جو علم سلوک سے واقف ہو اور نسبت رسولﷺ رکھتا ہو۔ بیعت کرنا فرض بلکہ فرض الفرائض ہے۔ یہی طریقہ اولیائے کرام کا ہے۔ قرآن پاک میں ہے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ وَجَاهِدُوْا فِیْ سَبِیْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿المائدہ:35﴾

''اے ایمان والو خدا سے ڈرتے رہو اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کے راستے میں جہاد کرو تا کہ تم فلاح پاؤ''

جو شخص اپنے گھر سے اس خیال سے روانہ ہو کہ چلو فلاں پیر صاحب کے پاس چلیں گے اور دیکھیں گے کہ لنگر کا انتظام کیسا ہے لوگوں کی حالت کیسی ہے اور راستہ میں وہ ممنوع باتوں سے اجتناب نہ کرے تو اسکو کوئی ثواب حاصل نہ ہوگا۔

مگر جو شخص تحصیل علم کے واسطے اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں جائے اور اس کا سارا کاروبار اور بیداری، کھانا، پینا، حرکات وسکنات اللہ تعالیٰ کیلئے ہوں تو یہ شخص صحیح معنوں میں طالب علم ہے۔ رسول کریمﷺ نے فرمایا۔

اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَو كَانَ بِالصِّیْنِ

''علم حاصل کرو اگر چہ چین تک جانا پڑے''

اس سے مراد بُعد ہے گو اس میں مشقت بھی اٹھانی پڑے۔ حدیث مبارک میں علم سے مراد قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ محض دنیاوی علم مقصود نہیں قاعدہ کلیہ ہے کہ **الشی اذا اطلق یرادبه الفرد الکامل** ''جب کبھی چیز کا مطلق ذکر ہو تو اسکی کامل صورت مراد ہوتی ہے'' چنانچہ علم ظاہری (شریعت) فرائض وواجبات سمجھ کر ہمہ تن علم طریقت میں مشغول ہو جائے۔

سوال ہفتم: کشف، معجزہ اور کرامت کیا چیزیں ہیں؟

جواب: کشف:

کشف ایک ہیئت خاصہ ہے جو کہ بعض اوقات صفائی قلب کے ذریعے ایک پوشیدہ امر کی اطلاع

ہو جائے اس اطلاع کا نام کشف ہے اور یہ کشف غیر مسلم کو بھی ہو سکتا ہے جو استدراج میں داخل ہے اور یہ کشف غلط بھی ہوتا ہے اس لئے یہ باطل ہے بخلاف کشفِ ولی و پیغمبر کے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّىْ لَاَجِدُ رِيْحَ يُوْسُفَ لَوْلَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴿یوسف: 94﴾

''اور جب قافلہ (مصر سے) روانہ ہوا تو ان کے والد کہنے لگے کہ اگر مجھ کو یہ نہ کہو کہ (بوڑھا) بہک گیا ہے تو مجھے تو یوسف کی خوشبو آ رہی ہے''

اور مثلاً جب حضرت عمرؓ نے جمعہ کے دن منبر پر خطبہ کے درمیان فرمایا ''اے ساریہ پہاڑ کی طرف دیکھو'' وغیرہ یہ کشف صحیح تھے۔

معجزہ

وہ امر ہے جو نبی سے اس کی نبوت کی تصدیق پر خلاف العادت (جو عقلاً محال ہے) ظاہر ہو جائے اور بغیر نبی کے دوسرے سے ظاہر نہ ہو سکتا ہو۔

کرامت

اس میں بھی ظہور خلافِ عادت ہی ہوتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ کرامت اس امر خلاف عادت ظاہر ہونے کا نام ہے جو ولی سے ظاہر ہو جائے اور یہی امر خلاف عادت اگر نبی سے ظاہر ہو جائے تو اسے معجزہ کہتے ہیں اور یہ دونوں امور تکوین میں داخل ہیں۔ تکوین وہ نعمتِ عظمیٰ ہے جو خداوند کریم کی طرف سے اس کے نیک بندے کو تصرف کامل حاصل ہو جائے۔

سوال ہشتم: عرس کیا چیز ہے اور اس کا مدعا کیا ہے؟

جواب: عرس کی اصلیت یہ ہے کہ طوفان نوحؑ کے وقت جب مکہ معظّمہ یعنی بیت اللہ شریف کی جگہ بیت المعمور آباد تھا بہت سے فرشتے بحکم الٰہی بیت المعمور کے پاس جمع ہو گئے اور پھر اس کو چوتھے فلک پر لے گئے اور بیت اللہ شریف کی جگہ ایک ٹیلہ مرتفع رہ گیا۔ بعدہ ہر سال حج مبارک کے ایاّم میں فرشتے اس جگہ پر جمع ہو جاتے تھے اسی اجتماع کی صورتِ جامعہ کو عرس کہا جاتا ہے جو موجودہ عرس کی اصلیت وہاں سے ہے لیکن عرس میں چند چیزوں کی ضرورت ہے۔

1۔ اجتماع مسجد میں نہ ہو۔

2۔ واعظ متدینّ و پرہیز گار ہوں۔

3۔ اشعار خلاف شرع نہ ہوں۔

4۔ عورتیں مردوں سے الگ رہیں۔

5۔ لوگوں کو اطاعت الی اللہ اور اطاعت الی الرسول کی طرف بلایا جائے۔

6۔ نمود وریاء اور علو نفس کے لئے مجلس کا انعقاد نہ ہو بلکہ نیت تعلیم اور تبلیغ میں صرف خوشنودیِ اللہ تعالیٰ ہو۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتے مقرر ہیں جب وہ زمین پر دورہ کرتے ہیں تو مجالسِ ذکر و تعلیم تلاش کرتے ہیں تو جب وہ مجلس علم میں حاضر ہوتے ہیں تو نزدیک والے فرشتے دور والوں کو بلاتے ہیں کہ آؤ ہم جس چیز کی طلب میں تھے وہ یہاں ہے۔ تو چپکے سے وہ فرشتے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب مجلسِ علم ختم ہو جاتی ہے تو خداوند تعالیٰ کے حضور عرض کرتے ہیں کہ ہم نے زمین میں فلاں جگہ مجلسِ علم دیکھی۔ اللہ تعالیٰ باوجود عالم الغیب ہونے کے فرماتا ہے اور پوچھتا ہے کہ میرے بندے کس چیز کا تذکرہ کر رہے تھے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ آپ کی یاد اور آپ کے محبوبﷺ کا تذکرہ کرتے تھے۔ خداوند کریم پوچھتا ہے کیا انہوں نے مجھے دیکھا ہے؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ انہوں نے آپ کو نہیں دیکھا تو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر وہ مجھے دیکھ لیتے تو پھر کیا کیفیت ہوتی؟ تو فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس صورت میں تو وہ مجنونانہ ذکر کرتے۔ خداوند تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے فرشتو گواہ رہو کہ میں نے ان سب کو بخش دیا پھر فرشتے عرض کرتے ہیں کہ ہم نے اس میں اس جگہ فلاں آدمی دیکھا جو اپنی غرض اور کام کیلئے آیا تھا۔ نیت اس کی وعظ سننے کی نہ تھی خداوند کریم فرماتے ہیں کہ میں نے اسے بھی بخش دیا کیونکہ **لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ وَلَا خَابَ اَنِيْسُهُمْ** (ان کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہ سکتا اور نہ اس سے تعلق والا ناکام ہوتا ہے)۔

7۔ وعظ سننے کیلئے تمام لوگ باوضو متوجہ ہو کر بیٹھیں اور بغور سنیں۔

عرس کے انعقاد سے مقصود حصولِ علم اور اچھے لوگوں سے ملاقات اور اجتماعی دعا میں شریک ہونا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ چالیس سے زیادہ مسلمان لوگ اگر ایک جگہ جمع ہو کر بخلوص نیت خداوند کریم کے دربار میں دست بدعا ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا کو مستجاب فرماتا ہے۔

سوال نمبر: شغلِ طریقت وسلوک مسلمانوں میں کیا زیادتی پیدا کرتا ہے؟

جواب: شغلِ طریقت مسلمانوں میں نورِ ایمان کی زیادتی پیدا کرتا ہے نورِ ایمان میں زیادتی باعتبار زیادہ عبادت اور زیادہ ذکرِ الٰہی کے ہوتا ہے اسی طرح سے نورِ ایمان میں کمی باعتبار کمیِ عبادت اور عدمِ ذکرِ الٰہی سے ہوتی ہے **الایمان یزید و یَنْقَصُ** یہ باعتبار اعمال کے ہے وہ نورِ ایمان جو خداوند کریم بسبب کلمہ طیبہ **لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ الرَّسُوْلُ اللّٰه**

مومن مطمئن بالایمان کوعطا فرماتا ہے اس میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، جب انسان حسن عقیدہ سے اطمینان قلب حاصل کر لیتا ہے، اطمینان قلب ہی کی آیت مبارکہ **لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِىْ** کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو مومن کامل بن جاتا ہے اور یہ یمن و برکت مرشدِ کامل طریقت میں داخل ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ بعض لوگ اپنے پیر صاحب کے پاس اس غرض کیلئے جاتے ہیں کہ چلو طریقت میں داخل ہو جائیں گے اور پھر اپنے گھر پر اللہ اللہ یا کوئی دوسرا ذکر کر لیں گے اور اس طرح خود پیر بن جائیں گے۔ یہ بات فضول اور لغو ہے۔ ان کی مثال اس آیت کے مطابق ہے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًاo اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿الکھف: 103,104﴾

''کہہ دو کہ ہم تمہیں بتائیں جو عملوں کے لحاظ سے بڑے نقصان میں ہیں۔ وہ لوگ جن کی سعی دنیا کی زندگانی میں برباد ہوگئی اور وہ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ وہ اچھے کام کر رہے ہیں''

سوال دہم: غوث اور قطب کون ہوتے ہیں وضاحت فرمائی جائے؟

جواب: ولی کامل کی صفت اوپر گزر چکی ہے وہ تمام صفات غوث اور قطب کی بھی ہیں جب یہی ولیِ کامل بامراد اپنے شیخِ کامل کے مقام حضور بامراد کو پہنچ جاتا ہے تو وہ قطب کہلاتا ہے اور اس کا ذکر استغفار ہوتا ہے اور جب وہی کامل مقام حمدانیہ کو پہنچ جائے تو غوث کہلاتا ہے غوث کے معنی فریاد چاہنا ہوتے ہیں۔ جب لوگ بذریعہ اور وسیلہ اس بزرگ کے، حوائج از درگاہ الٰہی چاہتے ہیں تو وہ غوث کہلاتا ہے اور ذکر اس کا **یا ذوالجلال والاکرام** ہوتا ہے۔

ماحصل آنکہ یہ ہے کہ بندۂ مومن متقی کے قلب پر جب اثر ادراکِ حقیقت کا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ **جَلَّ شانہٗ** کی ذات اور صفات کا علم ضروری اور بدیہی اور حضوری تک پہنچ جائے جس کا اثر یہ ہو کہ اطاعت کی رغبت اور معصیت سے نفرت ہو کر خالق کی رضامندی کی طلب و مخلوق کی ناراضگی سے اجتناب کر کے شریعت غرّہ پر پختگی اور اتباعِ سنت رسولﷺ طبعی اور غیر ارادی ہو جائے، یہی ولایت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وضعِ شریعت ظہور حقیقت کے لئے ہے اور اسی سے مقامات ولایت حاصل ہوتے ہیں۔

آخر میں غوث المعظم اعلیٰ حضرت جناب پیر صاحبؒ نے نہایت جامع دعا فرمائی اور تمام حضرات کو کھانا کھا کر جانے کی اجازت فرمائی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

خطبہ مجلس کبریٰ

عرس مبارک جولائی 1952ء

عرس مبارک کی مجلس کبریٰ منعقدہ جولائی 1952ء میں علمائے پاکستان کی طرف سے چند سوالات پیش کئے گئے جو مندرجہ ذیل ہیں:

1۔ انسانی زندگی کا کیا مقصد ہے؟

2۔ نسبت رسولیﷺ سے کیا مراد ہے تشریح فرمائی جائے؟

3۔ ولایت کیا چیز ہے؟

4۔ کیا زیارت قبور جائز ہے یا نہیں؟

5۔ ذکر الٰہی کیا ہے اور کس طرح کیا جائے؟

6۔ تصورِ شیخ سے کیا مراد ہے؟

7۔ فیض لازم ومتعدی کیا ہے؟

8۔ کیا بیعت طریقت ضروری ہے؟

9۔ طریقت میں شیخ کا کیا مقام ہے؟

عرس شریف کی مجلس کبریٰ میں تلاوت قرآن پاک، ذکر بالجہر، نعت شریف اور شجرہ شریف پڑھنے کے بعد اعلیٰ حضرت پیر صاحبؒ نے کوئی پچاس ہزار مجمع سے خطاب فرمایا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ حضورؒ نے فرمایا کہ دو باتیں ضروری ہیں۔ اوّل یہ کہ عرس شریف کی کاروائی ایسے وقت ہو رہی ہے کہ تمازت آفتاب اور وقت کی وجہ سے بعض عمر رسیدہ یا نازک مزاج اشخاص تھک گئے ہوں گے یا گھبرا گئے ہوں گے اس لئے تقریر مختصر ہوگی۔ دوئم علمائے پاکستان نے جو سوالات پیش کئے ہیں ان پر اجمالاً واختصاراً گفتگو ہوگی کیونکہ تفصیلی بات کا موقع نہیں ہے۔

انسانی زندگی کا مقصد

انسان کو اپنی زندگی جو اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی مختصر اور عارضی وقت کے لئے عطا فرمائی ہے اس کا صحیح مقصد سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی قلیل وقت کی زندگی اور اس کے اعمال پر ابدی زندگی کا انحصار فرمایا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًاؕ ﴿الملک2﴾

''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے''

تمام امورات اسباب زندگی قیام زندگی کے لئے ہیں اور زندگی صرف مالک الملک کی غلامی عشق اور محبت کے لئے ہے تا کہ اس کی رضا وخوشنودی حاصل کی جائے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴿الذریت :56﴾

''اور میں نے جنوّں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں''

اس لئے دنیا کی چند روزہ زندگی میں نسیان خودی حاصل کرنا چاہیے اور اپنا خیال صحیح کرنا چاہیے۔ جب خیال صحیح ہو جاتا ہے اور زندگی کا رخ صرف مالک الملک کی طرف ہوتا ہے تو پھر تمام زندگی عبادت بن جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر زندگی رائیگاں اور فضول ہو جاتی ہے۔

نسبت رسولﷺ

فرمایا کہ ایک وقت تھا کہ لوگ صحیح طور پر مسلمان تھے اور خدا کے دوست تھے ایسے لوگوں کی حرکات وہی تھیں جو رسول اکرمﷺ کی تھیں ان کے باطن میں بھی خدا اور اس کے رسولﷺ کی بے حد محبت تھی۔ ایک سمندر یا دریائے نور تھا۔ جس میں وہ نورانی مچھلیوں کی طرح تیرتے تھے اور ماسوا اللہ کی آلائش سے پاک تھے۔ ان لوگوں کا ظاہر و باطن ایک جیسا تھا۔ دراصل وہ لوگ باطن اور ارادت سے بہت آگے نکل چکے تھے وہ اللہ کے محبوب بندے بن چکے تھے۔ موجودہ وقت میں اس نقشے کا پیش کرنا یا سمجھنا بہت مشکل ہے اُس وقت قرآن حکیم احکام الٰہی اور دین کا ایک جسم تھا اور یہ اس کے اعضاء تھے۔

اُس وقت سب اعضاء اور پرزے ہم آہنگ تھے اور ایک دوسرے سے جدا نہ تھے۔ آج کل یہ کیفیت ہے کہ ایک صاحب مولوی ہیں، عالم ہیں، وہ دنیا سے اپنے آپ کو الگ سمجھتے ہیں۔ وہ احکامِ الٰہی اور مسائلِ دینی کے علاوہ کچھ اور نہیں جانتے۔ ایک صاحب درویش ہیں جو صرف عبادات اور وظائف میں مصروف ہیں دنیا اور اس کے کاموں سے لاتعلق ہیں۔ ایک شخص حاکمِ وقت ہے وہ صرف انتظام حکومت میں مصروف ہے وہ اپنے آپ کو خلافت کا وارث سمجھتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک صاحب صوفی ہیں جو کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اللہ سے ملاتے ہیں۔ لیکن یہ سب ہر ایک دوسرے سے جدا ہیں اور الگ الگ ہیں۔ یہ سب غلط روی میں مصروف ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے کیا کیا؟ انہوں نے حضور اکرم ﷺ کی صحیح اور درست پیروی کی۔ ان کی زندگی اور ان کا عمل اور ان کے افعال واقوال اور اخلاق دیکھنے اور سمجھنے کے قابل ہیں۔ وہ شاندار درخت جو حضور اکرم ﷺ نے بصورت اسلام دنیا کے سامنے پیش کیا اس کی شاخیں کٹ گئیں اور درخت سے الگ ہو گئیں۔ اس شاندار درخت کی اب وہ آب وتاب باقی نہیں۔ جب سب شاخیں اور اعضا اکٹھے تھے تو وہ جسم یا درخت ایک تھا یعنی اسلام ایک تھا۔ اس وقت بادشاہت، درویشی، مولویت وغیرہ ایک دوسرے سے الگ نہ تھی۔

اُس وقت حضرت عمرؓ سب سے بڑے دنیاوی فقیہہ، سب سے بڑے صوفی اور سب سے بڑے دنیاوی سلطان تھے۔ وہ مخلوق خدا کو خدا سے ملانے میں بھی مصروف تھے اور ساتھ ساتھ ان کی دنیاوی اور ظاہری خدمت بھی کرتے تھے۔ نسبت رسول ﷺ کی وجہ سے ایک انسان کے اندر وہ تمام صفاتِ ہم آہنگی موجود تھیں۔ پھر وقت آیا کہ نسبت رسول ﷺ کے اجزاء پریشان ہو گئے۔

حضور پیر صاحبؒ نے فرمایا کہ مدت دراز کے بعد اللہ پاک کے فضل وکرم سے میری کوشش اور سعی ہے کہ وہی نسبت رسول ﷺ پھر اسی طرح صحیح وسالم اس دنیا میں واپس آ جائے۔ پانی اسی طرف جاتا ہے جس طرف ڈھلوان ہوتی ہے۔ بڑے بڑے خلفاء اور صحابہ کرام موجود تھے لیکن وہ نسبت رسول ﷺ حضرت سلمان فارسیؓ کے پاس چلی گئی حالانکہ وہ غلام تھے۔ ہماری اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہی نسبت رسول ﷺ ملتِ اسلامیہ میں پھر واپس آ جائے۔ کسی شخص نے مجھے کہا کہ آپ خلاف شرع کام کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ میری انتہائی کوشش ہے کہ اللہ پاک کے فضل وکرم سے امیر وغریب، گورنر، افسران سرکار، مولوی صاحبان، مسکین، صوفی، فقیر و درویش سب میں وہی صفات پیدا ہو جائیں جو رسول اکرم ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیں۔ میرا فرض ہے کہ وہ چیز جو رسول اکرم ﷺ دنیا میں لائے اس کو دنیا کو پہنچادوں۔ ورنہ جہاں تک میری ذاتی حیثیت کا تعلق ہے میں قبلۂ عالم حضرت نظام الدینؒ دربار

کہیاں شریف کا ادنیٰ غلام ہوں میری ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک پرنالہ ہوں بس ایک ہی چیز ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ رسول مقبولﷺ کی ظاہری اور باطنی مکمل متابعت کی جائے اور دل و جان سے حضور سرور کائناتﷺ کے طریقہ پر اللہ پاک کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ پھر نہ کوئی طریقت ہے نہ شریعت ہے نہ کوئی روحانیت اور نہ حقیقت۔ بس وہی ہے جو رسول اکرمﷺ نے ہمیں نسبت رسولﷺ کی صورت میں عطا فرمائی۔ قرآن پاک میں آیا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴿الذريت :56﴾

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کریں''

باخدا انسان اور نفس پرست انسان

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ صرف دو طرح کے انسان ہیں ایک باخدا اور دوسرے نفس پرست۔ اس کے سوا اور کوئی تفریق نہیں انسان یا تو بندۂ خدا ہے اور یا بندۂ نفس۔ جب انسان بندۂ خدا یا دل سے مالک کا غلام ہو جاتا ہے تو اس کی ہر حرکت اور تمام زندگی عبادت ہو جاتی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص نفس پرست ہو تو اس کی ہر حرکت اپنی نفس پرستی کے ماتحت ہوگی۔ اس لئے سراسر غلط ہوگی۔

ولایت

مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ ولایت کیا چیز ہے؟ ولی اللہ وہ شخص ہوتا ہے جس کی اپنی ذات مفقود ہو چکی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں وہاں کوئی اور ذات کار بند ہو جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں شخص کو جن چڑھ گیا ہے جن نظر نہیں آتا لیکن ایسے شخص کی تمام حرکات اس کے حکم کے تابع ہوتی ہیں یہی حال ولی اللہ کا ہوتا ہے وہ فنا فی اللہ ہو چکا ہوتا ہے اور بس۔

زیارتِ قبور

زیارتِ قبور کے متعلق سوال پوچھا گیا ہے فرمایا کہ رسول اکرمﷺ نے پہلے قبروں پر جانا منع فرمایا لیکن بعد میں اجازت دے دی۔ لیکن صرف اس خیال سے کہ جو شخص مر چکا ہے اس کی زندگی کے حالات سے سبق اور عبرت حاصل کی جائے۔ اہل اللہ کی قبروں پر جا کر صاحبِ قبر کے وسیلہ سے خدا سے مانگنا جائز ہے۔ ابوالقاسم قشیریؒ نے فرمایا ہے کہ جس وقت سوال کرنے والا یہ سمجھ لے کہ مجیب کون ہے اس وقت اس کا سوال قبول ہو جاتا ہے۔

ذکرالٰہی

ذکرالٰہی کے متعلق فرمایا کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ﴿آل عمران:18﴾

''خداتواس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبودنہیں''

بعض علما لفظ **''اللّٰہ''** کو اسم ذات کہتے ہیں۔ اللہ اسم ذات نہیں۔ لفظ اللہ ملحق بالصفات ہے لفظ اللہ معبود برحق کا نشان ہے۔ اللہ کی ذات اس وقت بھی تھی جب کچھ نہ تھا اور جب دنیا اور کائنات فنا بالصفات اور ختم ہوجائے گی اس وقت بھی وہ ذات باری تعالیٰ موجود رہے گی جیسے قدیم سے تھی۔

لفظ **''ھو''** قرین ذات ہے ذکر کا طریقہ ہے **''اللّٰہ ھُو''**۔ صرف **اللّٰہ** نہیں پڑھنا۔ **اللّٰہ** الگ ہے اور **ھُو** الگ۔ اللہ ایک اسم ہے جو مبداء تمام صفات ہے دوسرا اسم ھو ہے جو قرین ذات ہے۔

تصّورِشیخ

فرمایا: اگر کوئی یہ سمجھے کہ شیخ کا تصّور کر کے یا تصویر سامنے رکھ کر ذکر کرنا ہے تو یہ درست نہیں۔ تصّورِشیخ کا صحیح راستہ یہ ہے کہ شیخ ایسا باخدا اور صاحب کمال ہو کہ اس کے قریب ہو کر اپنی ذات بھول جائے اور شیخیت تصدیق ہوجائے۔ یہ اضطراری کیفیت ہو اختیاری نہیں۔

فیض لازمی ومتعدی

فرمایا: میں نے ایک مرید کو چٹھی لکھی کہ فلاں کام کرو۔ وہ راسخ العقیدہ شخص تھا اس لئے چٹھی کو کھولا تک نہیں اور رومال میں باندھ کر گھر کے اندر رکھ چھوڑی اور جواب نہ بھیجا۔ بہت لوگ ہیں جو قرآن مجید کو پڑھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ شیخ کے پاس بعض لوگ فیض یاب ہو جاتے ہیں اور بعض نہیں۔ فیض کے لازمی اور متعدی ہونے کے اسباب کے متعلق حاجی سردار محمد سرفراز خاں صاحب کی چٹھی میں لکھا گیا تھا۔

یوم حشر

حضور پیر صاحبؒ نے فرمایا کہ ایک دن آنے والا ہے کہ جب تمام مخلوق خدا اللہ پاک کے سامنے پیش ہوگی۔ نیک وبد، اچھے بُرے، چھوٹے بڑے سب وہاں حاضر ہوں گے آپ سے ہمارے متعلق اور ہم سے آپ کے متعلق پوچھا

جائے گا۔اس دن کی حاضری کا استحضار رہنا چاہیے تا کہ اس روز شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

شیخ کا فرض

فرمایا :ہمارے پاس مخلوق خدا مختلف اغراض لے کر آتی ہے ہمارا فرض ہے کہ ان کو اللہ پاک کا صحیح راستہ بتائیں اور مالک الملک سے ملنے کا طریقہ بتائیں۔عام مسلمان کعبۃ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں یہ غلط ہے۔کعبۃ کو اللہ پاک کی حقیقت سمجھ کو سجدہ کرنا چاہیے ایسا سجدہ قیمتی اور بامعنی ہوتا ہے اور قربِ الٰہی کے قریب لے جاتا ہے۔ہمارے پاس مخلوق خدا چاہے کسی غرض سے آئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر کسی کو اللہ پاک کی بارگاہ کے راستے کی تلقین کریں اور مستحق لوگوں کو بارگاہ رب العزت میں پیش کردیں۔

آخر میں غوث المعظم اعلیٰ حضرت جناب پیر صاحبؒ نے نہایت جامع دعا فرمائی اور تمام حاضرین کو تیار کھانا کھانے کے بعد اجازت فرمائی۔

☆

محمد ہے متاعِ عالمِ ایجاد سے پیارا
پدر۔ مادر۔ برادر۔ مال و جان۔ اولاد سے پیارا
محمد کی محبت دینِ حق کی شرطِ اوّل ہے
اسی میں ہے اگر خامی تو سب کچھ نا مکمل ہے
(حفیظ جالندھری)

☆

غَرِیْبَمْ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ غَرِیْبَمْ
نَدَارَمْ در جہاں جزتو حَبِیْبَمْ
بریں نازم کہ ہستم امتِ تو
گنہگارم و لیکن خوش نصیبم
(مولانا جامی)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ

ایک مجلس اگست 1953ء

ایک مجمع کثیر کے سامنے خطبہ ارشاد فرمایا جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

فرمایا : جب تک انسان کا خیال درست نہ ہو اس وقت تک اس کے اعمال کا نتیجہ مفید نہیں نکلتا خواہ نماز ہی پڑھ رہا ہو یا کوئی اور کام سرانجام دے رہا ہو۔

کیا دیکھتے نہیں ہو کہ اللہ تعالیٰ مومن کے قتل عمد کی وجہ سے انسان کو داخل فی النار کا عذاب دیتا ہے جبکہ دوسری صورت میں صحیح خیال سے رضائے الٰہی کی خاطر انسان دوسرے انسان کو جہاد میں قتل کرتا ہے تو اس کے درجات بلند ہو جاتے ہیں؟ پہلی صورت میں قاتل کے تمام اعمال نماز، روزہ وغیرہ سب رائیگاں چلے جاتے ہیں اور دوسری صورت میں تھوڑے اعمال ہی حکم جہاد کی تعمیل کے باعث مقبول ہو جاتے ہیں اور وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ یہ سب کام خیال کی درستی یا غلطی پر منحصر ہیں۔ پہلا قتل نفسانی وذاتی خواہشات کے ماتحت کیا گیا اور دوسرا قتل اللہ تعالیٰ کی محبت اور رسول پاک ﷺ کی محبت اور اطاعت میں کیا گیا۔

پس ثابت ہوا کہ جو کام خالصتاً اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی رضا کی خاطر کیا جائے تو اسکا ثمرہ نیک اور اجر عظیم ٹھہرتا ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ جو کام خواہ تجارت ہو ملازمت ہو یا کوئی اور پیشہ ہو۔ نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ سب کاموں میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھے۔

انسان سوچے کہ میں اس دنیا میں کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے یہاں کیا کرنا ہے؟ اور پھر کدھر جانا ہے؟ آخر اس دنیا میں تو میری اپنی تمنا کے مطابق قیام ممکن نہیں۔ پس انسان کو اُس جگہ کے لئے انتظام کرنا چاہیے جہاں اس نے آخر کار جانا ہے تاکہ خالی ہاتھ ہونے کی وجہ سے عاقبت میں ندامت نہ اٹھانی پڑے۔ اپنی حالت ایسی بنائے کہ دنیا میں رہ کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستہ پر مستقل زندگی گزارے تاکہ اسے رضائے الٰہی حاصل ہو اور وہ آخرت میں فلاح یاب ہو جائے۔

چونکہ نظامِ الٰہی کے مطابق سب نے اللہ تعالیٰ کے ہاں پیشی کے لئے جانا ہے اس لئے جملہ امور کی انجام دہی اسی ذات پاک کے لئے ہو اور اس ذات سے ملی ہوئی زندگی گزارنی چاہیے یعنی باخدا زندگی ہو۔ پس چاہیے کہ دل ذکر میں، فکر صفات باری تعالیٰ میں اور اعضائے جسمانی نیک کاموں میں مشغول رکھے۔ یہی اللہ تعالیٰ سے قرب حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔

ایسے لوگوں کی تعریف اللہ تعالیٰ ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴿النور: 37﴾

''ایسے لوگ جن کو خدا کے ذکر سے نہ سوداگری غافل کرتی ہے اور نہ ہی خرید وفروخت''

آخر میں غوث المعظم اعلیٰ حضرت پیر صاحبؒ نے نہایت جامع دعا فرمائی اور مجلس برخاست ہوئی۔

☆

هُوَ الْحَبِيْبُ الَّذِىْ تُرْجٰى شَفَاعَتُهٗ
لِكُلِّ هَوْلٍ مِّنَ الْاَهْوَالِ مُقْتَحِمٖ

☆

شاہبازِ لا مکانی شانِ اُو
رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنِىْ شانِ اُو

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ مجلس کبریٰ

عرس مبارک 20 جون 1954ء

عرس شریف کی مجلس کبریٰ منعقدہ 20 جون 1954ء کے موقع پر جناب قاضی خورشید حسن صاحب لاہور نے ذیل کے سوالات اعلیٰ حضرت پیر صاحبؒ کی خدمت میں پیش کئے۔ جن کے جوابات عطا فرمائے گئے۔

سوالات

1۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ اگر کسی بزرگ یا ولی اللہ سے بیعت کی ہوئی ہو اور وہ بزرگ ظاہری حیات سے پردہ پوش ہو جائیں تو مرید اپنی بقیہ تربیت کیلئے کسی دوسری جگہ بیعت کر سکتا ہے؟ کیا دوسری جگہ بیعت یا نسبت نامناسب یا معیوب تو نہیں؟

2۔ ترکِ دنیا کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ قرآن حکیم اور سنت مطہرہ کی روشنی میں بیان کیجئے؟

3۔ فقر و فقیری کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ اور حضور کریم ﷺ کے ارشاد **اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ** کی کیا تشریح ہے؟

4۔ اسم ذات ''اللّٰہ'' اور ''ھُو'' کے متعلق ارشاد فرمائیں۔ اسم ذاتی اور صفاتی کیا ہیں؟

5۔ لطائفِ قلبی کی ماہیت، حقیقت اور مقصد کیا ہے؟ نیز عالم امر اور عالم خلق کی حقیقت کی تشریح کی جائے؟

6۔ ولی اللہ کی کیا پہچان ہے اور یہ کیسے بنتے ہیں؟ اور پیر کی اولاد کی حیثیت مرید کی نظر میں کیا ہونی چاہیے؟

7۔ پیر یا شیخ کے توسل کے بغیر معرفت الٰہی حاصل ہو سکتی ہے یا کہ شیخ کا وسیلہ ضروری ہے؟

جوابات

فرمایا: آپ کا وجود نہایت قیمتی ہے۔ ہر انسان کو تسلی رکھنی چاہیے کہ اس کا وجود تمام کائنات سے قیمتی ہے اور وہ کائنات کی تمام خوبیوں کا ظرف ہے اور وہ ظرف الٰہی ہے۔ ان سوالات میں سے صرف دو سوالوں کا جواب دینے کیلئے پوری دو کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ پس نہایت اختصار سے اور مدلّل جملوں میں اشارتاً سمجھاؤں گا۔

اگر کسی ولی اللہ سے بیعت ہے تو دوسری جگہ بیعت کرنا عام طور پر لوگ نہیں جانتے۔ **اِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا** حکم قرآنی ہے۔ اگر مخلوق میں کوئی آدمی اللہ کے نام کے لئے ہو تو پھر عمل ایسا ہو کہ اللہ کے سامنے ندامت اور شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔ ایک دن ایسا آنے والا ہے جب ہم کو، آپ کو اور سب کو اپنے اپنے خیال وعمل کا جواب دینا پڑے گا۔ اُس وقت کا خیال رکھ کر یہاں موجودہ زندگانی میں عمل اور فعل کرنا چاہیے۔ انسان کا وجود کیوں قیمتی ہے؟ کیوں بہتر ہے؟ ایک بہت بڑی دولت جو ساری کائنات عالم بالا اور عالم ملکوت سے فوق الفوق ایک دریائے نور ہمارے سامنے آیا ہے۔ وہ حقیقت محمدیﷺ ہے اگر اس حقیقت کا ایک جزو کسی نبی یا ولی میں آیا تو وہ جزو تھا لیکن پورا نہیں۔

فرمایا: اس کی مثال بجلی کے پاور ہاؤس کی مانند ہے بجلی پاور ہاؤس سے نکل کر آتی ہے اگر ایک جگہ لاکھوں بلب پڑے ہوں مگر جب تک ان کا تعلق پاور ہاؤس سے نہیں ہوتا بلب روشن نہیں ہوتے اور بے فائدہ ہیں۔ بلب کو یہ وجود سمجھو جب تک اس کا تعلق حقیقت محمدیﷺ کے نور (پاور ہاؤس) سے نہ لگ جائے کوئی فائدہ نہیں سوائے اس حقیقت محمدیﷺ کے نہ کوئی حقیقت ہے نہ اسلام نہ دین۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑوں سے بھی سورج کی شعائیں منعکس ہوتی ہیں۔ تھوڑی بات کو سمجھنا چاہیے۔ ہر انسان کی حیثیت بلب کی طرح ہے اس میں روشنی کی اہلیت اور مادہ موجود ہے۔ صرف تھوڑی کوشش اور سمجھ سے خیال کو ٹھیک کرنا ہے۔ جس میں نسبت رسولﷺ کی روشنی اور مادہ نہ ہو بے فائدہ اور فضول ہے۔ ان آثار کی کیا نشانی ہے؟ دریائے نسبت رسولﷺ میں ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ سب اسی دریا کی تیرتی مچھلیاں ہیں۔

حضرت عمرؓ کے صاحبزادے ایک دن امام حسنؓ وامام حسینؓ کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ آپس میں کچھ ناراضگی ہوئی۔ حضرت امام حسینؓ نے صاحبزادے سے کہا کہ تم ہمارا مقابلہ نہیں کر سکتے تم تو میرے ناناﷺ کے غلام کے بیٹے ہو۔ اس نے اصرار کیا کہ میرا باپ تو بادشاہِ معظم ہے۔ جب گھر گئے تو اپنے والد بزرگوار سے شکایت کی۔ حضرت عمرؓ نے بیٹے سے کہا اگر واقعی یہ بات ہے تو امام حسینؓ سے لکھوا کر لے آؤ تب یقین کروں گا۔ صاحبزادے دوڑتے ہوئے گئے اور لکھوا کر لے آئے کہ عمرؓ میرے نانا حضرت محمدﷺ کے غلام ہیں۔ صاحبزادہ صاحب خوش تھے کہ اب انکا کام بن گیا۔ اگلے روز حضرت عمرؓ نے سب لوگوں کو مسجد نبوی میں جمع کیا اور بعد نماز ظہر فرمایا کہ لوگو: رسول مقبولﷺ کی غلامی میں سب کچھ قربان کر کے میں سوچا کرتا تھا کہ یہ غلامی قبول بھی ہوئی یا نہیں؟ لیکن آج مجھے تحریری سند مل گئی ہے جو حضورﷺ کے نواسہ کی تحریر شدہ ہے اور یہ میری زندگی کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ آپ سب گواہ رہیں۔ جب میرا جنازہ قبر میں رکھا جائے تو یہ پرچہ بھی ساتھ رکھا جائے۔ الغرض ایسا ہی ہوا یہ تھی نسبت رسولﷺ۔

اب غور طلب بات ہے کہ واقعہ کربلا میں کیا چیز ہے؟ قرآن موجود تھا، علماء موجود تھے، قاری موجود تھے، شریعت کے احکام موجود تھے لیکن امام حسینؓ کے سر اقدس پر تلوار چلی۔کیا وہ لوگ مسلمان نہ تھے؟ انہوں نے قرآن کریم نیزوں پر بلند کئے ہوئے تھے اوران کی طرف سے آوازہ اٹھا کہ جلدی کرو ہماری نماز عصر قضا ہو رہی ہے۔ یہ کیسی نماز تھی؟ اور کونسا اسلام تھا؟ آخر فرق کرنے والی کیا چیز تھی؟ صرف یہی کہ ان میں نسبت رسولﷺ نہ رہی تھی ورنہ رسول خداﷺ کے نواسے امام حسینؓ کے مرتبہ میں تو کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ہمیں چاہیے کہ یہ بلب جیسی یہ وجود نسبت رسولﷺ سے منور ہو جائے کیونکہ بوتل کا نام نہیں لیا جاتا اس میں پڑی ہوئی دوا یا شربت یا چیز وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے۔نسبت رسولﷺ اگر آجائے اور قائم رہے تو اس کی مثال ایک ایسے مکمل درخت کی ہو جاتی ہے جس کی جڑ، تنا اور تمام شاخیں وغیرہ سب اسی نسبت میں ہوتی ہیں۔ یہ طریقت کی فلاسفی ہے۔

لوگ دور دراز سے اپنے تفکرات لے کر یہاں آتے ہیں اگر نہ بھی آئیں تو مالک الملک کے ہی دربار میں پیش کرتے ہیں۔سب کی حاجات کو بارگاہ رب العزت میں ہی پیش کرنا ہے۔سب دردوں کی دوا اللہ ہے۔ جب تم لوگ ادھر آؤ تو صرف اللہ کے نام کی عزت اور اسی کے نام کی خاطر آؤ۔اپنی حاجات بھی لاؤ لیکن ارادہ اور خیال صرف اللہ سے تعلق پیدا کرنے کا ہی ہونا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کے لڑکے غسل فرما رہے تھے اتنے میں حضرت عمرؓ تشریف لے آئے۔ پوچھنے پر صاحبزادے نے کہا کہ غسل بالضرورت ہے۔آپ نے فرمایا کہ غسل کے ساتھ جمعہ کی نیت بھی کر لیتے تو دونوں کا ثواب حاصل کر لیتے کیونکہ نیت سے اعمال کی حیثیت بدل جاتی ہے۔مثلاً ایک شخص بھوکا ہے اور ریچھ کی طرح کھانے کو بیٹھ جاتا ہے برخلاف اس کے دوسرا شخص اسی حالت میں وضو کر کے اس نیت سے روٹی کھاتا ہے کہ میں حضورﷺ کی سنت پوری کروں تو حقیقت بدل جاتی ہے۔

فرمایا : حضورﷺ کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا کہ میں بہت گنہگار ہوں۔آپﷺ نے فرمایا کہ تمہارے ہاں کوئی بچہ ہے؟ اس نے عرض کیا ہاں ایک ننھی بیٹی ہے۔فرمان ہوا کہ اس کے لئے مٹھائی لیتے جانا۔اس سے تمہاری بیٹی خوش ہو جائے گی اور مالک الملک تیرے سارے گناہ معاف کر دے گا کیونکہ وہ غفور الرحیم ہے۔ مالک الملک کے دربار میں محض اللہ کی رضا حاصل کرنے کیلئے تم آئے ہو۔اس لئے اسی کام سے تمہاری گناہ معاف ہو جائیں گے۔

فرمایا : رسول پاکﷺ کو تنگ کرنے کیلئے کفار کے لڑکوں نے آپس میں صلاح کی کہ ایک لڑکے کا نام محمد رکھا اور باقی سب مل کر اس کی بے عزتی کرنے لگے۔تو حضور پاکﷺ کو اس بات کے سننے سے رنج ہوا۔ جبرائیلؑ فوراً

حاضر ہوئے کہ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ جس لڑکے کا نام ان کافروں نے محمد رکھا ہے آپﷺ کے نام کی خاطر اس پر دوزخ حرام کر دی گئی۔ خداوند کریم کو حضرت محمدﷺ کے نام مبارک کا بہت لحاظ ہے۔ ہماری یہ مجلس بھی نسبت رسولﷺ کی خاطر ہے۔ پس یہاں آ کر اپنی جان کی خدمت نہ کرو بلکہ لوگوں کی خدمت کر کے اپنا باطن روشن کرنے میں مصروف رہو اور اپنی رفتار زندگی کو درست کرو۔ اس تمہید کے بعد فرمایا۔

سوالات کے جوابات بالاختصار

1۔ جس کسی بزرگ (مردِ کامل) سے بیعت ہو اگر یہ بیعت خداوند تعالیٰ کی رضا مندی اور رسول خداﷺ کی تابعداری کیلئے ہے تو درست ہے اور یہی حقیقی بیعت ہے جو قیامت تک ٹوٹ نہیں سکتی۔ البتہ اصل ومعنوی بیعت کے بعد اگر اصل مقصود حاصل نہ ہو تو نئی بیعت درست ہے اور پرانی کالعدم۔

2۔ ترک دنیا یہ نہیں کہ کاروبار چھوڑ کر جنگل میں جا بیٹھے ترک دنیا معنوی حقیقت ہے ایک عالم خلق ہے جس میں ہماری دنیا ہے دوسرا عالم امر ہے جو نور مطلق ہے وہ کُن کہنے سے پیدا ہوا اس کا مصدر عرش نوری ہے۔

دنیاوی زندگی میں جسمانی اغراض سفلی ہیں اور انسان کو دنیا میں محو کرتی ہیں پس نفسانی خواہشات کو زیر کر کے روبہ خالق رہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے اسباب دنیا سے جو محض انسانی وجود کے لئے پیدا کئے گئے دل نہ لگائے اپنی جان اللہ تعالیٰ کی محبت میں وقف کر دے۔ قرآن مجید میں ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى o فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى ﴿النّٰزعت: 40,41﴾

''اور جو اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا اور جی کو خواہشوں سے روکتا رہا اس کا ٹھکا بہشت ہے''

3۔ فقر وفقیری بھی یہی چیز ہے۔ سب اعمال، سب کام محض اللہ کی رضا کیلئے ہوں۔ ایک شخص کروڑ پتی ہے مگر اسے دنیاوی لالچ نہیں تو وہ دنیا دار نہیں ہے۔ برخلاف اس کے دوسرا شخص ننگ دھڑنگ ہے مگر دنیا کا لالچ لئے ہوئے ہے وہ دنیا دار ہو سکتا ہے لہذا جو شخص بھی دنیا کے لالچ میں مگن ہے وہی دنیا دار ہے اس کی ظاہری مال ودولت اس کے دنیا دار ہونے کا ثبوت نہیں ہو سکتی۔

اہل فقر کی کیفیت اضمحلال کی ہے۔ جیسی ایک مردے کی حالت غسّال کے ہاتھ میں ہے جو اپنی مرضی کے مطابق اسے غسل دیتا ہے اس کی نماز جنازہ پڑھی جا چکی مگر اس مردے کی زندگی مالک کے ساتھ ہے سونے چاندی کے ڈھیر بھی اگر اس کے سامنے رکھ دیے جائیں تو اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں رکھتے اور نہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ کیفیتِ اضمحلال میں وہ حقیقت میں اپنے اللہ کے ساتھ ملا ہوا ہے اس کی مثال **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى** ہو جاتی ہے۔ ''وہ اپنی خواہشِ نفس سے کوئی بات نہیں کرتا۔''

4۔ اللہ سب سے بڑا اسم ہے وحدہ لاشریک ذات کی طرف صفت ہے۔ صفاتی لحاظ سے اسم ذات ہے۔ ''ھوٗ'' اس ذات پر دلالت کرتا ہے یہ اسم ذات اور اسم اعظم ہے۔

5۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا وہ پوشیدہ ہے ظاہر نہیں کہ ان آنکھوں سے دیکھا جا سکے باطن کی نظر اور معنی رکھتی ہے اس نے انسانوں میں نبی بھیجے جو ان میں سب سے بہترین گروہ ہے۔ خیر البریہ حضرت ابراہیمؑ کو بھیجا۔ وہ چاہتا ہے کہ سب ابراہیمؑ کی طرح دوستی پیدا کریں۔ درود ابراہیمی نماز کا جزو ہے۔ رسول پاکﷺ کی حقیقت علوی ہے۔ ابراہیمؑ کی حقیقت زمین کی ہے۔ ابراہیمؑ کی سنت یعنی حج فرض ہے ظاہری کے علاوہ باطنی معاملات کو ان کے مطابق کیا جاتا ہے جو ان ہستیوں کے ساتھ متعلق ہیں۔ خدا کے قرب کے حصول کیلئے صرف ایک ہی دروازہ ہے جو رسول خداﷺ کا ہے۔

6۔ بزرگوں کی اولاد اور بزرگی مالک الملک کا فضل و کرم شامل ہونا ضروری ہے۔ سلوک طریقت کسبی چیز ہے حسبی و نسبی نہیں۔ آدمؑ کے دو بیٹے ہابیل اور قابیل تھے۔ شیطان نے باوجود تھوڑا تجربہ رکھنے کے انہیں آپس میں لڑا دیا اور ایک کو دوسرے سے قتل کرایا۔ البتہ کسی بزرگ کی اولاد سے عناد یا بغض رکھنا بربادی کا باعث ہے۔

7۔ اوپر کافی بیان ہو چکا ہے حضرت موسیٰؑ کو بھی اللہ تعالیٰ نے خصوصی تعلیم کے لئے ایک شخص سے ملنے کے لئے بھیجا۔ اس واقعہ کا کلام پاک میں واضح طور پر ذکر ہے جیسا کہ سورۃ الکھف کی آیات 65 تا 82 میں بیان ہوا ہے۔

آخر میں غوث المعظم اعلیٰ حضرت پیر صاحبؒ نے جامع دعا فرمائی اور تمام حاضرین کو کھانا کھا کر جانے کی اجازت فرمائی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ مجلس کبریٰ

عرس مبارک 21 نومبر 1954ء

تقریباً چالیس پچاس ہزار معتقدین کا اجتماع تھا۔اس مجلس عام کو غوث المعظم اعلیٰ حضرت پیر نظیر احمد صاحبؒ نے خطاب فرمایا۔آپ کے خطبہ کا خلاصہ ذیل ہے۔

خطبہ کا خلاصہ

روز محشر اور اعمال صالحہ

فرمایا: جس طرح آج کے دن آپ سب یہاں جمع ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا کہ آپ سب اور میں جمع ہوں گے اور اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہوں گے۔اس موقع پر آپ کے متعلق مجھ سے سوال ہوگا اور میرے متعلق آپ سے۔ہمیں ایسے کام کرنے چاہئیں کہ اُس دن ہمیں مالک کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

اغراض ومقاصد

آپ یہاں محض تقریریں سننے نہیں آئے آپ یہاں درد، دکھ، تکلیفیں اور مصیبتیں لے کر آئے ہیں۔ آپ لوگ یہاں اپنے اپنے خیال اور اپنی اپنی تکالیف کے ساتھ آئے ہیں۔دل میں حسرتیں، مرادیں اور تمنائیں لے کر آئے ہیں، آپ دلوں کی سیاہی کا دھبہ دور کرنے آئے ہیں اور اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگنے آئے ہیں۔ میں آپ سے تین باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

1۔طریقت کی ضرورت

قرآن شریف کے بارے میں دین اور مذہب کی تمام بنیاد اور تمام شرعی احکامات قرآن مجید میں موجود ہیں اور اسے پڑھ کر تمام احکامِ الٰہی معلوم کئے جا سکتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کے مطالعہ سے ہم دین اور ضروریاتِ دین سے پورے واقف ہوجاتے ہیں۔

سورۃ فاتحہ

سورۃ فاتحہ قرآنی مضامین کا خلاصہ ہے۔ اس میں چند آیات کا مضمون فرض ہے اور چند کا واجب ہے **اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ** سے لیکر **اِيَّاکَ نَعْبُدُ وَاِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ** تو حمد، ربوبیت، صفات، عبادت، استعانت غرض تمام کلیاتی مضمون مکمل ہوگیا۔ ان آیات میں عبادات کے تمام طریقے وذہنی رفتار عمل وغیرہ غرض ہر جزو دین کا کامل بیان ہوگیا۔

تعلق باللہ

اس کے بعد **اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ** سے جو صراطِ مستقیم مانگا جاتا ہے وہ **اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** کا راستہ ہے یعنی ان لوگوں کی راہ جس راستہ پر چلنے والوں پر اللہ کی نعمتیں نازل ہوئیں۔ ان آیات کا موضوع یہ ہے کہ ان علمی، عملی، ذہنی اور خیالی خدمات کو انجام دینے کے بعد خدا تعالیٰ سے ہم کو ایک معاوضہ ملنا قرار دیا گیا ہے اور یہی وہ عظیم الشان انعام ہے جس کا حقدار صرف انسان ہی کو بنایا گیا ہے اس لئے اس راستہ کو اختیار کرنے میں صحیح ہدایت یعنی رہنمائی مانگ رہے ہیں جو ہم کو سیدھا خدا تک پہنچا دیتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جو بطور انعام سابقین مقربین کو دیا گیا۔ اسی راستہ پر چلنے کی وجہ سے وہ اس چیز سے پاک رہے جس کی پاداش میں ان پر ناراضگی یا غضب نازل ہوتا اور وہ کبھی گمراہ بھی نہ ہوئے۔ غرضیکہ اس ام الکتاب کی حقیقت دو حصص میں منقسم ہے پہلا حصہ صراطِ مستقیم سے متعلق ہے جو علمائے دین سے ملتا ہے اور دوسرا حصہ جو **اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** سے متعلق ہے وہ سالکین اور خواص طریقت کی تربیت وتعلیم سے مل سکتا ہے اس پر چل کر تعلق باللہ قائم ہوتا ہے اور یہی مشائخ طریقت کا راستہ ہے۔

طریقت نسبت رسولﷺ

جب انسان اپنے عمل سے صراط مستقیم اختیار کرلیتا ہے اور **اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** کے راستے پر پہنچ کر اپنا رخ کلی طور پر ذاتِ الٰہی کی طرف پھیر لیتا ہے تو اس پر باطنی کیفیات طاری ہوتی ہیں وہ انوار جو رسول خداﷺ کے سینہ مبارک میں متجلی تھے وہ انوار متابعت رسولﷺ سے اس ارادتمند کے سینہ میں منعکس ہوں گے۔ قرآن مجید حضورﷺ کے باطن کا عکس ہے خود اللہ نے حضورﷺ کی تعریف فرمائی ہے یہی **اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ** والا صراطِ مستقیم تو ہے جو حضورﷺ سے اور ان لوگوں سے، جنہوں نے یہ راستہ حضورﷺ سے حاصل کیا ہے سیکھا جا سکتا ہے یہی طریقت نسبت رسولﷺ ہے اور اس راستہ کو نائبِ رسولﷺ یعنی شیخ طریقت کی بیعت اور متابعت کے ذریعے طے کیا جاسکتا ہے۔

2۔رہبر باطنی

دوسری بات یہ ہے کہ مجھے کوئی قطب کہتا ہے،کوئی غوث اورکوئی ابدال جیسا جس کونظر آ تا ہے وہ کہتا ہے میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ میں کیا ہوں اور میرا کیا درجہ ہے۔ میں مالک الملک کا ایک ادنیٰ غلام ہوں گویا میں مالک کے ہاتھ میں ایک چھڑی کی طرح ہوں جس کے ذریعے وہ لوگوں کو اپنے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ دروازہ میرا ہے۔ (اس موقع پر حضورؒ نے ایک چھڑی ہاتھ میں لے کر دائیں سے بائیں جانب گھمائی اور فرمایا) کہ میں ایک سادہ بے جان چھڑی کی طرح ہوں جو مالک کے ہاتھ میں ہے اور جو مخلوق کو مالک کا دروازہ دکھاتی ہے اور بس۔

3۔دلی مراد(غلامی آقائے دوجہاںﷺ)

تیسری بات یہ ہے کہ جیسے آپ لوگوں کی مرادیں ہیں اسی طرح میری بھی دلی مراد ہے ایک دیرینہ تمنا ہے۔ اس وقت تمام وہ لوگ موجود ہیں جو میرے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔اس لئے میں بھی اپنی مراد بیان کرنا چاہتا ہوں۔ میری مراد یہ ہے کہ میرے گلے میں ایک بہت بڑا ہار ہو اور اس میں آپ سب لوگ پروئے ہوئے ہوں اور میرا سر حضور نبی کریمﷺ کے قدموں پر ہو۔(اپنی مراد کا اظہار اس جذبے سے کیا کہ آپ کے رقت بھرے الفاظ نے مجمع پر رقت طاری کر دی۔راقم الحروف)

دعا

خطبہ کے اختتام پر آپ نے تمام حاضرین اور خادمینِ لنگر کے لئے دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ان سب لوگوں کی دلی مرادیں پوری فرمائے۔محتاجوں کو غنی کرے۔ بے اولادوں کو اولاد دے۔قرض داروں کے قرض ادا ہوں اور اس رسولیؐ جماعت میں جو اصحاب داخل ہوں ان کے ذریعہ رسولیؐ نسبت کو ترقی ہو اور پشت در پشت ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں جن کو اس سلسلہ نسبت رسولیﷺ کی توفیق حاصل ہوتی رہے۔

دعا کے اختتام پر آپ نے فرمایا ''ہماری جماعت کا کسی اور جماعت یا سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ محض نسبت رسولیﷺ کی روحانی جماعت ہے اور میں تاکید کرتا ہوں کہ آپ سب لوگ اس روحانی جماعت کی خدمت کریں۔میں نے ہارون الرشید کو حکم دے دیا ہے کہ وہ اس روحانی جماعت کی ہمیشہ خدمت کریں۔''

خطبہ اور دعا کے بعد بڑی مجلس ختم ہوگئی۔تمام لوگوں کو کھانا کھا کر جانے کی اجازت فرمائی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا اِنَّکَ اَنۡتَ الۡعَلِیۡمُ الۡحَکِیۡم

مجلس کبریٰ نومبر 1955ء

خطبہ (موضوع طریقت)

مسئلہ تجدّد امثال

اصول حکمیہ کی رو سے وہ تغیرات جو دنیا میں ادیان و مذاہب پر آتے ہیں یا جو حالات مخلوق پر آتے ہیں یہ لوازمِ دوراں وخصوصیات وقت ہیں اس لئے کہ عالم خود متغیر ہے۔ اس کے اجزاء بھی متغیر ہیں بلکہ عالم کا ہر جزو ہر فرد کے اجزاء بجائے خود تغیر پذیر ہیں۔ اسی حقیقت پر مسئلہ تجدّد امثال قائم ہے۔ تغیر کلی سے جو قباحت اور فسادات مخلوق میں رونما ہوتے ہیں ادیان واحکام الٰہی ان کی اصلاح کے لئے نازل ہوتے ہیں اس لئے یہ تمنا یا خیال کہ ہمیشہ کسی دین یا کسی مذہب یا کسی اصول کی ایک ہی حالت قائم رہے غلط ہے اور ناممکن ہے۔

اس حقیقت کی تفصیل بہت طویل ہے جس کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں اور غیر ضروری بھی ہے۔ اس تحریر میں صرف اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ کلی تغیر عالم کے زیر اثر جو تغیرات جزوی اشیاء اور موجودات پر آتے ہیں جس سے حقائق اشیاء وکیفیات حال بدلتے ہیں اس کی تکمیل کا زمانہ ہزار برس کے قریب ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے حالات وکیفیات مخلوق میں اس قدر انقلاب پیدا ہوتا ہے کہ جو دین ان کی اصلاح کی غرض سے لایا گیا تھا وہ خود مسخ ہو کر بے سود ہو جاتا تھا بلکہ مدعا کے برعکس ہو جاتا تھا۔

اسی بنا پر عادتِ الٰہی کا اظہار اس طرح ہوتا رہا کہ ہر ہزار سال کے بعد ایک رسول نئی کتاب آسمانی کے ساتھ دنیا میں مبعوث کیا جاتا تھا تا کہ اس قباحت کا ازالہ کرے اور اُس وقت کے اخلاقی امراض کا علاج کر کے لوگوں کو حقیقت پر متوجہ کرے اور ''العلاج بالضد'' کے اصول پر اس زیادتی اور قباحت وقتی کو اس کے برعکس احکام کے ذریعہ اس کی تردید کر کے حقیقت پر مجتمع کرے۔ چنانچہ جب دنیا میں توحید الٰہی اور اسلام کی تعلیم کے ساتھ ضرورتِ وقت کی بنا پر تاہّل پر حکم دیا گیا تو کثرت ازدواج بھی عبادت میں داخل ہوا مگر مرورِ ایام اور رفتار زمانہ نے وہ حالات پیدا کئے کہ ہر متقی اور با خدا شخص کے تقدس کا معیار ہی کثرت ازدواج ہو گیا اور تغیر حالات پر توحید اور عبادت کے اصول بھی مسخ ہو گئے

اب ''العلاج بالضد'' کے اصول پر مالک الملک نے ایک پیغمبر (حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام) دنیا میں مبعوث کئے جو کہ رہبان تھے نہ ان کا باپ، نہ تجارت، نہ معاش کا ذریعہ، نہ شادی ایک دم لوگوں پر نہایت تعجب کی ایک ضرب لگی کہ کیا ایسا آدمی بھی پیغمبر ہوسکتا ہے جو شادی بھی نہ کرے اور گھر اور ضروریات بھی نہیں رکھتا لیکن سب قوم نے پرُزور مخالفت کے بعد حقیقت غالبہ کو تسلیم کیا اور لوگوں کے خیال بدل گئے، حالات بدل گئے اور کارروائی پہلے دستور کے بالکل برعکس ہوگئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ہر شخص عیسیٰؑ کی مثال بن رہا تھا۔ ہر شخص رہبان کامل بننے کی آرزو میں مصروف تھا اور سلسلہ کامیابی کی حد کو پہنچ کر حد سے متجاوز ہوتا گیا اور تغیر زمانہ کے اثرات کے ماتحت وہ مدعا جو تاھل کی زیادتی کو مسدود کرنے کی غرض سے تھا وہ چیز اس قدر مقصود بالذات ہوکر اختیار کی گئی کہ ہر خاص و عام رہبان ہی بن رہا تھا۔ بعض اس دستور پر یہاں تک پہنچے کہ بہت اونچے ستون پتھروں اور اینٹوں کے بناکر ان پر پاکیزگی سے جا کر بیٹھ گئے اور تمام عمر اسی شغل میں اسی جگہ گزر گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہی ستون پرستش گاہ عوام ہوگئے اور اسی طریق پر تمام احکام و عبادات بھی حد سے زیادہ متغیر ہوگئے جن میں شیطانی حکومت جاری ہوگئی۔

بعثت رسول اللہﷺ

اب رفتارِ زمانہ کا تغیر اسی اصول پر اس حد تک پہنچا کہ مالک نے حضور سرور کائناتﷺ کو ایک مکمل کتاب قرآن شریف دیکر دنیا میں بھیجا تا کہ دنیا کو اس رہبانیت سے واپس کر کے اہل دنیا کو اعتدال پر لاکر ایسی کتاب سکھائے کہ وہ اصول زندگی زمانہ کے تغیرات سے بدل نہ سکیں اور وہی زندگی، وہی ضابطہ احکام الٰہی ہمیشہ جاری رہے جو کہ لوگوں کے جملہ اخلاقی امراض اور تمام قباحات کا دائمی علاج ہو یعنی تغیراتِ عالم کی خصوصیات ہونے کی وجہ سے دنیا میں اپنے اپنے وقت پر نمودار ہوتے رہنے کا جو دستور قدیمی ہے اس میں کوئی تبدیلی پیدا ہونی تو ناممکن ہے مگر لوگوں کے خیالات اور اعمال اور قوائے ذہنی کے اندر جو خرابیاں پیدا ہوکر اس وقت کا دین مسخ ہو جانے پر ہمیشہ نئے رسول نئے احکام بارگاہ الٰہی سے لاکر لوگوں کو اصلاح کرتے تھے۔ جن کو بعض قبول کرتے تھے اور بعض مزاحمت کرتے کرتے فنا اور نابود کر دیے جاتے تھے۔ دراصل وہ پیغمبر اور وہ احکام اس وقت کی اصلاح کیلئے مخصوص تھے، اس وجہ سے دوسرے زمانہ کے لئے دوسرے احکام کا نزول لازمی ہوتا تھا۔

نزول قرآن شریف

اب اس قرآن شریف کے نزول کے بعد یہ ضرورت ختم ہوگئی۔ اس لئے کہ یہ قرآن شریف ایک ایسا اعلیٰ اور ایسا مکمل پروگرام صلاحیت کا لے کر آیا کہ زمانہ کی ابتداء سے زمانہ کے اختتام تک کے واقعات اور قباحات و اخلاقی

امراض جو پیدا ہونے ممکن ہیں ان سب کے علاج اور اصلاح پر یہ قرآن حکیم مشتمل ہے۔اس موقع پر ذی فہم انسان کو خود بخود یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ تمام واقعات وقباحات واصلاحات زمانہ ماضی کے تذکرے بھی اس قرآن شریف کے جزو ہیں اور قیامِ قیامت تک مستقل زمانہ کے آنے والے مصائب وقباحات ممکن نقائص وامراض اخلاقی کی تشریح بھی اس کے جزو ہیں اور وہ علوم ومعارف جو آغاز عالم دنیا سے روحانی پیشواؤں کے منصب کی بنیاد تھے وہ بھی اس قرآن حکیم کے جزو ہیں اور وہ واقعاتِ عالم اور حوادثاتِ عالم اور تغیرات زمانہ کے آثار جن کا اس قرآن حکیم کے نزول کے وقت تصور بھی ناممکن تھا اور دنیا میں کوئی ذریعہ موجود نہ تھا کہ ان کا علم ہو سکے ان کی تشریح اور وضاحت بھی اس قرآن مبین میں موجود ہے اور جن کا اپنے وقت اور اپنے زمانہ پر اظہار ہوتا جا رہا ہے۔ ہر چیز کے اظہار کے بعد اس کی شہادت قرآن شریف میں دیکھی جاتی ہے جیسے کہ ایک پودا زمین سے پیدا ہوا اور اس کے چند پتے ہوں تو کیمیا گر دیکھ کر سمجھ لیتا ہے کہ اس کی یہ تاثیر ہے اور یہ بہت بڑا درخت ہوگا اور اس کے یہ فوائد ہوں گے۔اب اگر ایک ایسی کتاب مل جائے جس میں کہ اس درخت کے جوان اور مکمل ہونے اور تمام پتے لگنے اور پھول اور پھولوں کی ماہیت اور اس میں پھل لگنے اور پختہ ہونے کے اور اس کے دیگر فوائد بھی درج ہوں اور اس درخت کے منافی حیات ونقائص اور امراض کی کیفیت بھی درج ہو اور اس کا علاج بھی درج ہو اور اس کی کیفیت کی تشریح کے ساتھ اس کا مکمل فوٹو بھی موجود ہو۔شکل اور تشریح سے اس قدر علم ہو کہ کوئی چیز باقی نہ رہے اگر وہ کتاب ہاتھ آ جائے تو اس درخت کا پروگرام من وعن اس میں درج شدہ دیکھ کر اور وہ واقعات جو وقتاً فوقتاً رونما ہوتے رہے ہیں ان کو دیکھ کر اور کتاب میں اس کی تصدیق دیکھ کر ہر انسان کو اس کا یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ کتاب اس درخت کے متعلق کامل ہے۔کوئی کسی طرح ایک ذرہ یا حبہ بھر بھی اس سے باہر نہیں۔اس لئے اب اس کی موجودگی میں دوسری تشریح یا کتاب کی نہ ضرورت ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔دوسری کتاب اور تشریح کی اسی وقت ضرورت ہو سکتی تھی کہ اس کتاب میں کمی اور نقص ہو یا کمی اور نقص اس میں تسلیم کر لیا جائے۔اندریں حقیقت واقعہ یہ ثابت ہوا کہ جس وجود اور جس ہستی کے ذریعہ یہ چیز دنیا میں لائی گئی وہ مکمل تھی اور اس کے بعد اسے نہ کسی علم کی ضرورت ہے اور نہ دوسرے کتاب لانے والے کی ضرورت ہے لہذا یہ ثابت ہوا کہ حضور پاک ﷺ آخری پیغمبر اور خاتم النبیین ہیں اور یہ قرآن شریف دنیا کے اختتام تک اور قیام قیامت تک کے لئے مکمل علاج ہے اسی لئے ارشاد ہوا:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ﴿المائدہ:3﴾

''آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے
اسلام کو دین پسند کیا''

نہایت اجمال واختصار کے ساتھ تمثیلاً توجہ دلائی جاتی ہے کہ قرآن شریف جس وقت نازل ہوا اس وقت کے لوگوں میں اس وقت کی ضرورت جہاد تھی اور امید فتح اور اسلام کی حقیقت کی وضاحت کی ضرورت تھی اس لئے ان علمائے راسخین کے اذہان میں اس کے متعلق تشریح آتی اور ان واقعات کے تعین علمی ہو کر عملی تصدیق ہوتی گئی اور لوگوں میں حقیقی ایمان کی تکمیل ہوئی۔

اسی طرح دنیا میں وہ اشیاء جو از روئے علوم طبیعات ظہور پذیر ہوئیں وہ نہایت عجیب اور غیر متوقع تھیں۔ عقل اور علم کے خلاف تھیں جس پر کہ علوم سائنس وکیمسٹری وفلاسفہ وغیرہ مشتمل ہیں مگر جب قرآن شریف کو دیکھا گیا تو وہ حالات اور موجودات جو اپنے وقت پر ظاہر ہوئے کئی سو سال پہلے سے قرآن شریف میں ان کی تشریح وعلمی وجود موجود تھے۔ **علیٰ ھذا القیاس**. جب ہوائی جہاز آئے اور آسمان کی طرف سے مہلک بم گرائے اور زہریلی گیس کا وقت آیا تو یہ حالات اور واقعات جو اپنے اپنے اوقات پر رونما ہو رہے ہیں ان کی موجودگی میں ان کی تشریح قرآن شریف میں دیکھ کر یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اشیاء بھی قرآن شریف کی اطلاعات کی جزو ہیں۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ جب تک کسی چیز کا دنیا میں وجود موجود نہ ہو جائے اور اس کے متعلق ذہن میں کوئی اس کا علم یا تصوّر بھی نہ ہو سکے تو اس کا سمجھنا ناممکن ہے مگر جب وہ چیز سامنے آجائے تو اسی کا ذکر قرآن شریف میں بخوبی سمجھ آسکتا ہے جیسے کہ ارشاد حق ہے:

وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴿الانعام: 59﴾

''زمین کی اندھیریوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی تر اور خشک چیز ہے جس کا بیان کتاب مبین میں نہ ہو''

یہاں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ اوّلین میں ایسے لوگ موجود ہی نہ تھے جو اس آنے والے سامان اور عجائبات کا علم رکھتے۔ یہ غلطی ہے بلکہ اُس وقت ایسے لوگ بھی موجود تھے جو آنے والے واقعاتِ عالم کو بصیرت نوری سے جانتے تھے اور اس کا یقین رکھتے تھے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا ہے کہ

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ تَقَاصَرُ عَنْہُ اِفْھَامُ الرِّجَالِ

''تمام علوم قرآن مجید میں موجود ہیں لیکن لوگوں کے فہم ان کو سمجھنے سے قاصر ہیں''

اس موقعہ پر ایک عجیب قصہ یاد آیا۔ 1918ء میں چند عیسائی علمائے بیروت نے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں آ کر ایک موقعہ پر قرآن کی تشریح کرتے ہوئے مسلمانوں کو مخاطب کر کے سوال کیا کہ اس پر تعجب ہے کہ قرآن شریف کا دعویٰ حد سے زیادہ ہے کہ:

وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ﴿الانعام: 59﴾

''زمین کی اندھیریوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں اور نہ ہی کوئی ایسی تر اور خشک چیز ہے جس کا بیان کتاب مبین میں نہ ہو''

یہ دعویٰ بلا ثبوت ہے۔ یہ معترضین عربی کے اعلیٰ پروفیسر اور لاثانی عالم تھے ان لوگوں نے اعلیٰ اور جید مسلمان علما کے جلسہ میں یہ اعتراض پیش کیا۔اعتراض اس طرح تھا کہ جب یہ دعویٰ ہے کہ سوکھی اور گیلی کھجور تک یعنی ہر چیز کا بیان قرآن شریف میں موجود ہے اور ایک اندھیری رات میں ایک حبہ اور ذرہ بھی مفقود نہیں جس کا بیان قرآن شریف میں موجود نہ ہو باوجود اس قدر سخت دعویٰ کے چھوٹی اشیاء تو درکنار جرمن وار (1914ء تا 1918ء) جنگ عظیم جو جنگِ دنیا ہے اور ساری دنیا کا حادثہ ہے اس بڑی چیز کا ذکر تو اس قرآن شریف میں دکھلا دو تو ہم مان جائیں گے کہ یہ دعویٰ درست ہے۔

اب دعویٰ کی تردید اور تاویلات اور تشریحات علما نے اپنی اپنی استعداد کے موافق کیں مگر کوئی کارگر نہ ہوئی اور علمائے بیروت غالب آ گئے۔اب مسلمان علما کو سخت شکست ہوئی اور کسی تفسیر کسی کتاب میں یہ تشریح موجود نہ تھی۔ علمائے ظواہر سوائے کتاب کے کچھ جانتے ہی نہیں۔اب یہ واقعہ مشہور ہوا۔ بے حد کوشش کے باوجود مسئلہ حل نہ ہوا۔ آخر میں مولانا غلام کبریا خان صاحب بہاری شمس العلماء جو ہمارے استاد ہیں اور ایک مولانا ان کے دوست تھے جو بانکی پور انگریزی کالج میں عربی کے پروفیسر تھے یہ دو تین آدمی اس مسئلہ کے فکر وغم میں زیادہ بیتاب ہوئے اور کالج سے رخصت لیکر ایک طویل سفر اختیار کیا تاکہ بڑی بڑی لائبریریوں میں پرانی تفاسیر میں یہ مسئلہ دیکھا جائے۔ چنانچہ پٹنہ بہار میں ملک خدا بخش صاحب وکیل گزرے ہیں انہوں نے لکھوکھہا روپیہ خرچ کر کے ایک ایسی عظیم الشان جامع لائبریری قائم کی کہ تمام ہندوستان کیا بلکہ غیر ممالک میں بھی اس کی مثال نہیں ملتی۔ان علما نے سب سے اوّل پٹنہ بہار کا سفر اختیار کیا۔ جب لائبریری میں پہنچے تو حیران تھے کہ کونسی کتاب ملاحظہ کی جائے۔ پروفیسر صاحب بانکی پور نے کہا کہ حضرت محی الدین ابن عربی شیخ الاکبر کی تفسیر لائی جائے۔ چنانچہ لائی گئی۔مولانا نے بغیر ارادہ کتاب کو میز پر کھول کر رکھ دیا تو پہلی دفعہ میں یہ آیات قرآن شریف نکل آئیں۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۝ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ﴿الانفطار: 13,14﴾

''بیشک نیکوکار بہشت میں ہیں اور بے شک بدکار دوزخ میں ہیں''

مولانا نے صرف طرز بیان کو دیکھنے کے لئے پڑھنا شروع کر دیا تو حضرت شیخ الاکبر موصوف نے ان آیات کی

تشریح میں لکھا ہے کہ ایک زمانہ دنیا میں وہ آئے گا کہ ایک جنگ عظیم ہوگی اور بے شمار لوگ جہنم میں جائیں گے اور بے شمار بہشت میں جائیں گے۔ اب اس بیان کے بعد حضرت شیخ الاکبر نے ان آیات کے عدد نکال کر ایک خاص طریقہ پر جمع کر کے تقسیم کئے تو 1918ء کا عدد برآمد ہوا۔ حضرت شیخ الاکبر نے تشریح کی کہ عیسائی حکومت کا زمانہ ہوگا اور یہ واقعہ 1918ء میں پیش آئے گا۔ جب یہ عبارت مولانا نے پڑھی تو مولانا کی خوشی اور مسرت کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ انہوں نے کھڑے ہوکر رقص کرنا شروع کر دیا اور مولانا پر حالت وجد طاری ہوگئی کتاب کو سر پر رکھا، آنسو جاری ہوگئے، چہرہ سرخ ہوگیا اور ایک جوش پیدا ہوا۔ جو بڑی دیر کے بعد کم ہوا۔ مولانا نے کتاب کی اس تحریر کا فوٹو لیا اور علمائے بیروت کو لا کر دکھایا۔ علمائے بیروت کی زبان پر مہرِ خاموشی لگ گئی اور کوئی جرأت بولنے کی نہ رہی۔ اب اس واقعہ کا اثر نہ صرف عیسائی علماء پر ہی پڑا بلکہ علمائے وقت اہل اسلام میں جو وحید العصر تھے ان کو بھی یقین ہوا کہ ہم لوگ قرآن شریف کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور ہمارے علوم ناقص ہیں۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِىْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿یوسف:76﴾

''اور ہر علم والے سے اوپر ایک علم والا ہے''

اس کی تصدیق ہوگئی۔

ایک اور واقعہ یاد آیا کہ حیدرآباد سندھ کے رہنے والے ایک بزرگ (جو مولوی صوفی تھے) تشریف لائے اور مجھ سے درخواست کی کہ میں بہت امید لیکر آیا ہوں کہ یہاں ضرور کامیابی حاصل ہوگی۔ میری آرزو یہ ہے کہ میں بہت مدت سے سرگرداں ہوں اور ہزار ہا روپیہ خرچ کر چکا ہوں کہ ہڑتال ورقی متورم ہو جائے یا موم ہو جائے یا تیل ہو جائے۔ بوعلی سینا اور ارسطو کے اصول اکسیر اعظم سے واقف ہوں مگر کامیابی نہیں ہوتی اور چند خواص سے معلوم ہوا کہ آپ اکسیر کے عالم ہیں اس لئے مہربانی کریں۔ میں نے ان کو اس خیال سے منع کیا مگر وہ علمی بحث اختیار کر کے اپنی رائے اور مضبوط کر رہے تھے۔ آخر ایک دن قرآن شریف کے دعویٰ کو یاد کیا کہ **وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ** ﴿الانعام: 59﴾ اور کہا کہ قرآن شریف کی اس آیت کی تصدیق کے لئے ہی بتلا دیں۔ سخت مضطرب تھے اور اس پر مُصِر تھے کہ میرے یقین اور ایمان کو درست کرا دیں۔ چنانچہ ان کو قرآن کے الفاظ بتائے گئے اور کچھ مداومت کرنے میں ایک رات حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے خواب میں سبز گھاس دکھلایا اور حکم دیا کہ ہڑتال ورقی کو لوہے کے توے پر رکھو اور آگ جلاؤ اور اس گھاس کا پانی نکال کر ہڑتال پر ڈالتے رہو۔ چنانچہ انہوں نے بیدار ہوکر اس پر عمل کیا تو واقعی ہڑتال متورم ہوگئی اور موم ہوگئی۔ انہوں نے یہ ہڑتال تانبہ یعنی مس کے ٹکڑے پر لگا کر آگ پر رکھا تو وہ آگ کی گرمی سے سیاہ ہوگیا۔ جب نکالا تو سیاہی ٹکڑے بن کر گر گئی اور وہ ٹکڑا خالص سونے کا تھا۔ اب

وہ کامیاب ہو گئے اور قرآن شریف پر یقین زیادہ کامل ہو گیا۔ پندرہ صد روپے قرضہ تھا ادا کیا۔ مکانات وغیرہ بنوائے، بہت سی ضروریات مہیا کیں اور مالدار ہو گئے۔ جب وہ ٹکڑا ہڑتال کا ختم ہو گیا تو کام بھی ختم ہو گیا۔ اس کے بعد کئی بار اسی طرح ہڑتال کو توے پر رکھ رکھ کر اُسی بوٹی کا پانی ڈالتے تھے مگر ذرا اثر نہیں ہوا۔ ہڑتال اسی طرح قائم رہی۔ وہ بوٹی موہڑہ شریف میں ٹھیکیدار آزاد خان کے مکان کے نزدیک بکثرت موجود تھی۔ پھر اسی سودا میں ان کی تمام عمر ختم ہو گئی۔

مَقَالِیْدُ الْاَمُور

اس سے ثابت ہوا کہ تمام اشیاء وامورات تکوین مالک کے قبضہ میں ہیں اور ہر چیز کی خاصیت اور عمل اس کے اشارہ پر منحصر ہے۔ اور جو شخص قرآن شریف کے مالک کی طرف متوجہ ہو اس کو قرآن شریف کے وہ اسرار منکشف ہوتے ہیں جو **مَقَالِیْدُ الْاَمُور** ہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ہر شخص کو علم ہے کہ گورنمنٹ کے خزانہ میں لکھو کھہا بلکہ کروڑ ہا روپے پڑے ہوئے ہیں اور سب روپے لوگوں کے لئے جمع کرائے گئے ہیں گورنمنٹ خود ان کو نہیں کھاتی۔ اس امر کو معلوم کر کے کوئی شخص خزانہ کے نزدیک جا کر خزانہ کو سجدہ کرتا رہے یا ہاتھ جوڑ جوڑ کر مانگتا رہے تو خزانچی اس کو ایک پیسہ نہیں دے سکتا۔ اگر وہی شخص افسر خزانہ کے پاس جائے اور وہ طریقہ معلوم کرے جس سے روپیہ نکل سکتا ہے تو اس دستور پر عمل درآمد کر کے افسر خزانہ سے دستخط کرا کر خزانہ کے نزدیک جائے تو فوراً اس کو لکھو کھہا اور کروڑ ہا روپیہ مل سکتا ہے۔ عوام الناس کے سمجھنے کے لئے یہ مثالیں دی جاتی ہیں کہ ان کی سمجھ میں اصلی معاملہ آجائے۔

تفہیم قرآن مجید اور اولوالباب

اب کم از کم یہ تو سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ قرآن شریف دنیا کی ہر قسم کی نعمتوں سے پُر ہے۔ تمام اقسام کی مصیبتوں کے رفع کرنے کا ذریعہ ہے اور تمام مقاصد حاصل کرنے کا سبب ہے مگر اس مدعا کو حاصل کرنے کے لئے ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کا سینہ رسولِ خداﷺ کا صحیح غلام ہو کر نسبتِ رسولﷺ اور ضیائے ربانی کے انوار سے منور ہو چکا ہو اور قرآن شریف کے معارف واسرار اس پر منکشف ہو چکے ہوں اور درجۂ تکوین کی عزت حاصل کر چکا ہو اس کی رہبری اور ارشاد وتربیت سے وہ دستور اور طریقے معلوم ہو سکتے ہیں جن سے تمام دینی اور دنیاوی جزوی وکلّی امورات طے ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ صورت عمل میں نہ آئے تو اس مدعا کے حاصل ہونے کی امید فضول ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ قرآن شریف کو اور اس کے ترجمہ کو پڑھ کر ہم سب ضرورت پوری کر سکتے ہیں پھر کسی مرشد ورہبر کی کیا ضرورت ہے؟ مگر یہ خیال غلط ہے۔ اس لئے کہ سوالات کے زبدے کتابیں عام فہم اردو زبان میں موجود ہیں اور یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ان کتابوں کو دیکھ کر حساب دان یا اقلیدس کا عالم ہو سکے جب تک کہ اس کے گُر اور اسرار کوئی استاد

سمجھانے والا نہ ہو۔ انگریزی علماء قرآن شریف کو بلحاظ ادبیت کے اچھی طرح سمجھتے ہیں بلکہ ایام جاہلیت کے ہزارہا اشعار ان کو زبانی یاد ہوتے ہیں اور علم لغات میں کامل استاد ہونے کے باوجود قرآن کے معارف واسرار کو ان کا علم نہیں پہنچ سکتا اس کے سمجھنے اور سمجھانے والے اولوالالباب ہی ہیں۔ جن کو خدا نے فراست اور بصیرت نوری عطا فرمائی ہے اور ان ہی کی تعلیم وتربیت اور مجالس میں یہ دولت حاصل ہوسکتی ہے ورنہ ممکن نہیں ہے۔

بہر دستے نباید داد دست

اگر کوئی انسان اپنی ناسمجھی کی وجہ سے کسی نااہل اور صوفی نما یا مسلم نما شخص کے پاس جا کر اس کی غلط تعلیم اور غلط تربیت میں پھنس کر قرآن شریف پر عمل جاری کرے تو اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے کوئی شخص غلط اور قانون کے خلاف طریقہ پر خزانہ سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرے اس کے لئے خزانہ کا دروازہ نہیں کھل سکتا بلکہ حوالات اور جیل کا دروازہ اس کے لئے کھل جائے گا۔ اسی طرح اس غلط عمل کرنیوالے کے لئے بجائے رحمت کے قہر الٰہی کا دروازہ کھل جاتا ہے اور اس کی تمام زندگی غلط ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ عقدہ کہ کون شخص ولی ہے اور کس کی تعلیم پر صحیح راستہ کی کامیابی ہوسکتی ہے یہ بھی نہایت مشکل ہے۔ اس عقدہ کا حل صرف صحیح ارادت اور قرآن شریف کے معیار سے ہی معلوم ہوسکتا ہے کہ کس شخص کے ذریعہ اور کس شخص کی تقلید سے یہ مدارج طے ہو سکتے ہیں۔

حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

الغرض تغیرات زمانہ نے لوگوں کے قوائے ذہنیہ کو اس قدر مسخ کر دیا کہ وہ برعکس نہند نام زنگی کافور کے مصداق ہو گئے ہیں اور ہر اس چیز کو جو رضائے الٰہی اور وصول حق کا ذریعہ تھی اسے ذریعہ وصول ''ماسوا اللہ'' وخواہشات نفس بنانے میں مشغول ہیں عوام کی ذہنیت تو ''صاحب الغرض مجنون'' کے اصول پر خود ہی بے ٹھکانہ اور متزلزم ہے تو وہ بصیرت اور فراست جس سے غلط اور صحیح یعنی بندۂ نفس و بندۂ خدا کی تمیز ہو سکے کہاں سے لائی جائے۔ اس لئے کہ جو شخص حقیقی طور پر خدا کی ذات کا عاشق ہے اور اس کے قرب ولقا کا خواہاں ہے اس کے لئے تو مشکل نہیں کیونکہ جس طرح پیاسے کو پانی کی شناخت ہو جاتی ہے اسی طرح طالبِ حق کا ضمیر اس کی خود رہنمائی کرتا ہے اور سچے رہنما اور غلط صوفی نما لوگوں میں تمیز آسان ہو جاتی ہے۔ البتہ عوام الناس کیلئے یہ حالت نہ ہونے کی وجہ سے ضرور دشواری ہے۔ ہاں، ان کو اگر کسی قدر عقل ہے تو یہی معیار کافی ہے کہ دستور العمل رسولﷺ سے اور عبادت، اذکار، افکار واشغال کی

تعلیم سے توجہ ''ماسوا اللہ'' پر پیدا کی جاتی ہے تو یہ صورت گمراہی ہے اور وہ شخص ابلیس بصورت آدم ہے۔ **نعوذ باللہ من ذالک** اس کی تفصیل اور تشریح اپنی خداداد عقل کے ساتھ سمجھنا مناسب ہے۔

تعلیم قرآن کے تین اہم مدارج

اب واضح ہو کہ قرآن شریف نے دنیا کو تین چیزیں بتلائیں جن کی تشریح مختصراً ذیل میں درج ہے۔

1۔ درجۂ اسلام

قرآن شریف نے لوگوں کو بتایا کہ خدا وحدہٗ لاشریک ہے اور عالم دنیا مخلوق ہے اور ہر چیز خدا کی عبادت کے لئے ہے۔ دنیا **لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا** ﴿الملک2﴾ کے لئے ہے۔ ''تا کہ تمہاری آزمائش عملاً کرے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے''۔

قرآن شریف نے بتایا کہ تمام صحائف اور آسمانی کتابیں اور پیغمبروں کی تعلیم اور کردار قرآن شریف کا جزو ہیں۔ مخلوقِ خدا کو خالق کے احکام کی تعلیم دی اور بتایا کہ اسلام یہ چیز ہے۔ واضح ہو کہ انسان کیلئے خدا کی طرف صحیح طریقہ پر متوجہ ہونے کا پہلا درجہ اسلام ہے۔ اسلام کی تفصیل یہ ہے کہ نماز پنجگانہ، نوافل، حج کے ارکان، زکوۃ کی ادائیگی، روزہ، ذکر الٰہی اور اخوت اسلام یعنی ہر اس شخص کو جو مسلمان ہے اس کو حقیقی بھائی سے اسلام کی وجہ سے عزیز رکھنا اور اپنے مفاد پر اس کے مفاد کو ترجیح دینا۔ قرآن شریف کو پڑھنا اور اس کو سمجھنا۔ نماز کے الفاظ سمجھنا، معانی و موضوع معلوم کرنا۔ ہر وہ کام جو خدا نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا اور حکم دیا اس کو سمجھنا اور عمل کرنا۔ ہر وہ کام کہ جس سے خدا نے اپنے بندوں کو منع فرمایا اس سے اپنے نفس کو روکنا۔ حقوق والدین، حقوق اولاد، حقوق برادران، حقوق ہمسایہ، حقوق قوم، حقوق استاد، حقوق پیر راہبر روحانی کو ادا کرنا، غیبت، جھوٹ، زنا، حرام خوری، چوری، حرام کاری، فتنہ، فساد، ایذادہی اور شرارت وغیرہ کو ترک کرنا۔ ہمیشہ ذکر الٰہی میں مصروف رہنا، عورتوں کے حقوق کا لحاظ رکھنا اور ان کو برائی سے اور خراب عادتوں سے روکنا، عورتوں کو اپنے شوہروں کے حقوق کی پابندی اور شوہروں کو اپنی عورتوں کی رضامندی اور ان کی حقوق کے لحاظ رکھنا ان کو ایذا اور تکلیف اور غم نہ دینا۔ ملازموں اور خدمت گاروں کو تکلیف میں نہ رکھنا اور ذلیل نہ کرنا۔ بیع وشرا میں دھوکا نہ کرنا، گفتار بیان اور شہادت میں راستی اور صدق پر عمل کرنا، یتیم کی مدد کرنا، سائل محروم و مساکین کی خدمت کرنا، مصیبت میں صبر کرنا اور ادائے عمل میں امید اور استقلال رکھنا، اعمال کو ریا سے پاک رکھنا، امورات متعلقہ شرک سے بچنا غلط کاموں پر فضول خرچی سے بچنا جانی و مالی جہاد کو اختیار کرنا۔

تکمیل اسلام

الغرض انسان کا تمام پروگرام زندگی رسولی دستورالعمل کے مطابق ہواور قرآن شریف کی تعلیم کا نمونہ ہو۔ اگراس متذکرہ بالا اصول کا پابند ہواور یہ یقین رکھتا ہو کہ قیامت کا قیام واقعی ہے اور وہ یوم الحساب ہے اوران امور کی پابندی محض اس لئے کررہا ہے کہ احکام الٰہی ہیں اور ممنوعات سے اس لئے پرہیز واجتناب ہے کہ خدا نے منع فرمایا ہے اور اپنے اعمال وخواہشات میں نفسانی خواہشات اور مفاد پر رضائے الٰہی کو مقدم رکھتا ہے تو اس صورتِ کردار میں یہ شخص مسلمان کامل ہے۔ اگر پورا عامل نہ ہو تو وہ منافق اور **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** ﴿البقرۃ:85﴾
''تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ سے انکار کرتے ہو؟''

یہ متذکرہ بالا عمل درجۂ مسلمانی اور پہلا حصہ ہے۔

2۔ درجہ ایمان

تعلیم قرآنی کا دوسرا حصہ درجہ ایمان ہے۔ جس کی تشریح ذیل میں اجمالاً کی جاتی ہے۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ انسان کے قلب اور روئے حیات کی فطرت اس طرح ہے کہ وہ ایک ہی چیز سے دل بستگی رکھ سکتا ہے اور ناممکن ہے کہ دو چیزیں اس کی محبوب ومقصود ہوسکیں۔ نیز عالمِ دنیا میں سوائے دو چیزوں کے اور کوئی چیز بھی موجود نہیں ہے۔ خالق ہے یا مخلوق ہے۔ اس لئے انسان کی زندگی ان دو چیزوں میں سے ایک ہی کی محبت اور عشق میں گزر سکتی ہے یا تو رفتارِ زندگی مالک وخالق کی محبت واطاعت میں گزرے گی اور دل بستگی ذات الٰہی سے قائم رہے گی یا مخلوق سے اور اپنے نفس کی محبت اور اطاعت میں گزرے گی یعنی بالکلیہ دل بستگی نفس کے ساتھ ہی ہوگی۔ تیسرا راستہ زندگی کے لئے کوئی موجود ہی نہیں ہے یہاں پر اگر کوئی بے سمجھی سے یہ خیال پیدا کرے کہ انسان تو ہزارہا اشیاء سے محبت رکھتا ہے ایک سے مقیّد نہیں ہے جیسے کہ آدمی گھوڑا، موٹر، زمین، مکان، دولت، لباس، شادی، اولاد وغیرہ وغیرہ بے شمار اشیاء سے محبت رکھتا ہے اور بہت سی چیزیں ایسی بھی ہیں کہ جن کو جان ومال خرچ کرکے حاصل کرنا چاہتا ہے تو کس طرح تسلیم کیا جائے کہ ایک سے زیادہ کے ساتھ محبت کا ہونا ناممکن ہے اس لئے اس امر کی وضاحت کی جاتی ہے کہ فی الحقیقت متذکرہ بالا صورت کثیر التعداد اشیاء سے محبت نہیں بلکہ ایک ہی سے ہے۔ دراصل انسان کو اپنا نفس مقصود اور محبوب ہے اس لئے جو اشیاء نفس کی خواہش کے ماتحت اس کو پسند ہیں ان کا وہ مشتاق ہے۔ اس حقیقت کو قرآن شریف نے اتباع ہوی کی اصطلاح میں بیان فرمایا ہے۔

اَرَءَ یْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ط اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا O اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ط اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿الفرقان:43,44﴾

''کیا تم نے اسے دیکھا جس نے اپنے جی کی خواہش کو اپنا خدا بنالیا تو کیا تم اس کی نگہبانی کا ذمہ لوگے یا یہ سمجھتے ہو کہ اُن میں بہت کچھ سنتے یا سمجھتے ہیں۔ وہ تو نہیں مگر جیسے چوپائے بلکہ ان سے بھی بدتر گمراہ''

اس لئے کہ مقصود اور محبوب دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک مقصود بالذات دوسرا مقصود بالواسطہ۔ جو مقصود بالذات ہے وہ جوہر ہے اور جو مقصود بالواسطہ ہے وہ عرض ہے۔ اب یہ ثابت ہے کہ انسان کے درپیش دو ہی چیزیں ہیں یا اپنا نفس یا ذات الٰہی اگر انسان کو خدا سے قلبی تعلق ہے اور دلی محبت ہے تو وہ مجبوراً وہی چیز پسند کرتا ہے جو خدا کی طرف متوجہ کرنے والی ہے اور جس سے قرب الٰہی حاصل ہو اور دنیا میں اس کے تمام اعمال اور کردار وہی ہوں گے جو خدا کی پسند ہیں اور کوئی کام منافی رضائے الٰہی اس سے صادر نہیں ہوتا۔

انسان کی زندگی دو قسم کے کاموں پر مشتمل ہے۔

1۔ عبادات

2۔ معاملات دنیاوی

عبادات کی بنیاد دین پر ہے اور دین کی بنیاد اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی جب تک انسان شرک سے پاک نہ ہو جائے۔ شرک بجائے خود دو قسم کا ہے۔

1۔ شرک آفاقی

2۔ شرک انفسی

شرک آفاقی یہ ہے کہ وحدہ لاشریک کے علاوہ یا اس کے بغیر سورج، ستارے، آگ، پانی، ہوا، خاک وغیرہ یا بتوں کو معبود تسلیم کیا جائے جیسے کہ مشرک لوگ اب تک کر رہے ہیں اور آفاقی شرک کے معبودوں کی عبادت اور اطاعت میں انسان مشغول رہے اور خدا وحدہٗ لاشریک سے روگرداں و نافرمان ہو۔ اگر اس شرک سے توبہ کی اور خیالات صاف کر کے حقیقی معبود برحق وحدہٗ لاشریک کی عبادت اختیار کرے اور اسی حقیقی مالک کی تابعداری اور اس کے احکام قرآنی کے موافق عبادات ارکان اسلام کامل اختیار کرے تو اس صورت میں وہ شخص مسلمان ہے جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

اب دوسرا شرک شرکِ انفسی ہے۔ یہ شرک باوجود کلمہ پڑھنے اور ارکان اسلام کا عامل ہونے کے دل میں قائم رہتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ انسان نفس کا مطیع ہو اور اس کا نفس خواہشاتِ رذیلہ کا منقاد ہو۔ اب اس صورت میں انسان کی عبادات یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ سب کام خواہشاتِ نفس کے ماتحت عمل میں آتے ہیں لہٰذا تکمیل ایمان کی یہ شرط ہے کہ وہ اس شرکِ انفسی سے دل کو پاک کرے اور اس کا نفس خواہشاتِ رذیلہ سے رستگاری حاصل کرے اور اس کا دل ذات الٰہی کی محبت سے مالا مال ہو۔ اب اس صورت میں اس کا دل دونوں قسم کے شرک سے پاک ہے تو اس کو دولتِ ایمان حاصل ہوئی۔ چنانچہ اس حقیقت کی رہنمائی اس آیت شریف میں کی گئی ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿الکهف: 110﴾

''پس جسے اپنے رب سے ملنے کی امید ہو اسے چاہیے کہ نیک کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے''

تکمیل ایمان

اب سوال اس ایمان کی تکمیل اور ایمان کے نتائج کا باقی ہے۔ یہاں پر یہ جملہ معترضہ پیدا ہوا کہ انسان شرک انفسی سے دل کو کس طرح پاک کرے اور ایمان کی تکمیل کس طرح حاصل کرے مگر یہ تشریح اس کے بعد معاملہ کی حقیقت سمجھنے سے خود بخود واضح ہو جائے گی۔ یہاں یہ سمجھنا مقصود ہے کہ مطلق مسلمانی اور ایمان میں کیا فرق ہے چونکہ اس انسان کے دل میں محبت ذات الٰہی جاگزیں ہے اس لئے اس کے تمام حرکات وسکنات خدا ہی کی رضا مندی کے لئے ہوں گے اس لئے اس کا ہر کام عبادت ہی متصور ہوگا۔ خواہ عبادت کرے خواہ دنیاوی کام کرے سب خدا کی نوکری ہے۔ حقیقت اس کی تو یہ ہے کہ انسان کے اندر جو قوت دراکہ ہے جس میں ہر چیز کا عکس قبول ہوتا ہے اور ہر خیال اور ہر کام کی بنیاد اس عکس سے پیدا ہوتی ہے جو اس قوتِ مدرکہ کے اندر جاگزیں ہوا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شیشہ ہو جس طرف اس کا رخ صحیح کیا جائے وہی چیز اس میں معکوس ہوتی ہے۔ اب اگر مطابق ارشاد الٰہی:

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ﴿المزمل:8﴾

''اور اپنے رب کا نام یاد کرو اور سب سے ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو''

انسان ذکر الٰہی سے ذات الٰہی یعنی مذکور کی طرف متوجہ ہو تو اس ذات کے انوار اس قوت دراکہ میں مُتَجَلّی ہو کر اس میں سما جاتے ہیں۔ جس طرح کہ ایک شیشہ (آئینہ) خواہ چھوٹا ہو خواہ بڑا جب سورج کی طرف متوجہ کیا جائے تو

سورج اپنے شعشانِ انوار کے ساتھ اس میں معکوس ہوتا ہے تو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا سورج ہی ہے بلکہ روشنی کے علاوہ گرمی وسوزش بھی اسی طرح آ جاتی ہے۔ اب انسان جو مالک حقیقی کی ذات کی طرف اس طرح متوجہ ہو کہ اس کا آئینہ دل اثرات ماسویٰ اللہ سے خالی ہو تو وہ ذات الٰہی اس قوتِ درّاکہ کے عمل سے اس کے حقیقی اور معنوی قلب (جو کہ عالم غیب میں مکمل ہیئت انسانی ہے) اس میں تجلیات انوار کے ساتھ **متجلّی** ہوتا ہے تو یہ شخص صاحبِ ایمان (مومن) ہوتا ہے جیسے حکم ہے۔

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ عَرْشُ اللهِ تعالیٰ ﴿الحدیث﴾

''مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کا عرش ہے''

اندریں صورت اس انسان کی نفسانیت بشریت مفقود ہو جائے گی اور بشری اثرات یعنی اعمالِ ظلمانی ترک ہو جائیں گے اس لئے کہ ظلمتِ قلبی رفع ہو چکی ہے اور جب نور الٰہی سے منور ہو گیا تو تمام اعمال اس کے نورانی ہو جائیں گے۔ یہ صورت تکمیل ایمان کی ہے۔ اب اس صورت میں اگرچہ وہ جسم انسان ہے مگر فی الحقیقت وہ نور الٰہی کا ایک ظرف ہے جو خدا کی مشیت ہو وہ کام اس سے عمل میں آتا ہے، جو اس دل میں آئے وہ مالک کی منظوری کا ہوتا ہے اسی واسطے حضرت مولانا رومؒ نے فرمایا ہے۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

اس حالت میں عبادت کے جو الفاظ یا کلمات زبان سے نکلتے ہیں وہ الفاظ ذہن میں نہیں آتے بلکہ ان کا موضوع ذہن میں ہوتا ہے اور موضوع ومعانی اس اخلاص کی پیداوار ہوتے ہیں جس کے ذریعہ انسان خدا کی طرف متوجہ ہو رہا ہے۔ اب الفاظ کا تعلق صرف زبان سے ہی ہوتا ہے اور الفاظ کا وجود بعد میں پیدا ہوتا ہے اوّل معانی اور موضوع پیدا ہوتے ہیں اور اس نوری حقیقت سے یہ کیفیت رونما ہوتی ہے جو ذات الٰہی سے اقرب ہے۔ اب یہ نماز اس درجے کی ہوگی کہ

اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿الحدیث﴾

''نماز مومن کی معراج ہے''

جس کے لئے حکم صادر ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مومن ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کی نماز معراج المومنین ہو۔ اب اس کی ہر عبادت اسی اصول پر ہوگی۔ اسماء مرجع مسمّٰی ہوں گے اگر یہ انسان حج کرے تو ارکان حج ادا کر کے تسبیح وتہلیل پڑھ کر صرف حج کی ڈگری حاصل نہیں کرے گا بلکہ متذکرہ بالا ایمان کی صورت حج میں ہوگی یعنی ایک انسان

اقرب الی اللہ ہو جائے گا۔ یہ صورت ایمان حضرت ابراہیمؑ کی ہے۔ جن کو خلیل اللہ ہونے کی عزت حاصل ہوئی لہٰذا اس ایمان والے کو اس امر کی ضرورت ہے کہ اپنے ایمان کو حضرت ابراہیمؑ کی طرح مکمل کرے۔ انہی کردار، انہی شرائط اور انہی افعال پر عمل کرے اور اسی ارادے اور اسی اخلاص اور اسی ذہن کے ساتھ ان ارکان کی ادائیگی میں حضرت ابراہیمؑ کے ایمان اور جذبات سینہ میں محویت حاصل کرے تا کہ یہ شخص بھی حضرت ابراہیمؑ کے شجر قبولیت کا جزو بن جائے اور ابراہیمی جذبات میں ہمیشہ مستغرق رہے تو یہ شخص بھی خلیل اللہ ہے۔ اس جذبۂ ابراہیمی کے اثرات یہ ہیں۔ جان اور تمام مال کی قربانی پیش کر کے اپنے فرزندِ عزیز کو ارشاد الٰہی پر قربان کر دیا اور خدا نے ان کی محبت کی تصدیق کی اور جب حضرت ابراہیمؑ کو اس آگ میں ڈالا جا رہا تھا جس کی گرمی کی سوزش کئی میل تک پہنچ رہی تھی، تو سورج اور ہوا کے ملائک نے آ کر عرض کی اگر آپ فرمائیں تو اس آگ کو اٹھا کر سمندر میں ڈال دیں۔ آپ نے فرمایا کہ مالک دیکھ رہا ہے جو وہ چاہتا ہے ہم وہی چاہتے ہیں۔ اس کے بعد حضرت جبرائیلؑ آئے اور عرض کی کہ آپ فرمائیں تو میں اس آگ کو سمندر میں ڈال دوں۔ آپ نے فرمایا کہ مالک نے حکم دیا یا خود آئے۔ جبرائیلؑ نے عرض کی کہ خود آیا۔ اس پر حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ اگر مالک کو آگ میں ڈالنا منظور ہے تو ہم کو بھی منظور ہے اگر اس کو منظور نہیں تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ان کو حکم ہوا کہ خلیل اللہ ہیں اور ایک طرفۃ العین میں آگ گلزار ہو گئی اور شاہی تخت پر بہشتی لباس میں حضرت ابراہیمؑ کو بٹھا دیا گیا۔ یہی جذبہ تکمیل ایمان اور عشقِ الٰہی کا ہے اور یہی حاصل کرنا مقصود ہے۔

اہل ایمان کی فتح ونصرت

اسی جذبہ اور اسی ایمان کے لوگ تھے جو دنیاوی کوئی تجربہ نہیں رکھتے تھے اور کوئی طاقت وسامان جاہ وجلال ان میں موجود نہ تھا۔ تاہم اس ایمانی خاصیت اور خدائی طاقت سے جس طرف رُخ کیا ہزار ہا برس کی حکومتیں ان کے آگے سرنگوں ہو گئیں اور دنیا کی اقوام ان کی مفتوح ہو گئیں اور ثابت ہو گیا کہ ان کے وجود میں وہ چیز ہے جس سے ان کا ہر ایک ارادہ خدا کی طاقت سے پورا ہو رہا ہے اور یہ وجود وہ تھے جن کے صدری انوار کی روشنی سے تمام جہاں روشن ہوا اور اس خدائی طاقت سے ساری دنیا بدل گئی۔ مدتوں یہ سلسلہ ایمان کامل جاری رہا اور ایک دریائے نور میں یہ لوگ مچھلی کی طرح تیر رہے تھے۔

اسبابِ تنزل

مگر وہ دستور اور وہ تغیرات زمانہ بھی اپنے اصول پر دنیا میں جاری تھے اور لوگ بھی دوسرے درجہ کے پیدا ہوتے گئے جن میں تغیرات زمانہ کے دستور نے اپنا عمل جاری کیا اور قلوب مومنین میں بھی تغیر پیدا ہوتا گیا۔ جس قدر اس نسبت رسولﷺ اور تجلی انوار ذاتی میں کمی آتی گئی اسی قدر انسانی قوت دراکہ میں جاہ وجلال دنیاوی کے

تصورات جاگزیں ہوتے گئے گویا مومنین کی حقیقت ایمانی مفقود ہوتی گئی۔صوم وصلوٰۃ، حج، اذان و زکوٰۃ۔تمام احکام اسلام موجود تھے مگر انسانی حقیقت پہلے درجۂ اسلام پر واپس گئی اور لوگ صرف مسلمان رہ گئے۔آخر ان لوگوں میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جن کی تلوار سے وہی وجود جن سے ساری دنیا ضیائے ربانی کی روشنی سے مالا مال ہوچکی تھی قتل ہوئے۔ حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علی کرم اللہ وجہہ یہ لوگ ان مسلمانوں ہی کی تلوار سے شہید ہو گئے۔ واقعۂ کربلا ان ہی مسلمانوں کے اعمال کی یادگار ہے۔حضرت حسینؓ کے گلے پر ان ہی مسلمانوں نے تلوار چلائی۔ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کو ان مسلمانوں ہی نے قید کیا اور زہر دلوایا۔الغرض ان واقعات اور متذکرہ بالا کیفیات ایمان پر غور کرنے سے ہر انسان کو یہ پتہ چلتا ہے کہ اب مسلمانوں میں سے کوئی ایسی چیز گم ہوگئی جس کی وجہ سے یہی مسلمان جو خدائی طاقت کے مظہر تھے جس کی وجہ سے تمام دنیا ضیائے ربانی کے انوار سے روشن ہوگئی تھی اور سب دنیا کی طاقتیں اہل اسلام کے آگے سرنگوں ہوچکی تھیں۔اس چیز کے گم ہو جانے کے سبب مسلمانوں کے خیالات اور اعمال اس قدر برعکس ہوگئے کہ مسلمانوں ہی نے ان لوگوں کو جو انوارِ الٰہی کے ظرف تھے اور نسبتِ رسولﷺ کے مصادر تھے ان کو خود اپنی تلوار سے نابود کیا۔اس سے ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے اندر خدائی طاقت کے عمل اور فتوحاتِ عالم کا سبب اور ذریعہ صرف وہ حقیقتِ ایمانی تھی جس کا ذکر حصہ دوئم میں ہوا اور بعد کے جو واقعات اس کے برعکس یعنی ذلت، تباہی اور محتاجی کے رونما ہوئے یہ اس کی حقیقت ایمانی اور نسبت رسولﷺ کے مفقود ہونے کے نتائج ہیں۔

اس وقت اس تشریح اور تذکرہ سے مدعا یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں بھی مسلمان اکثر کلمہ خواں موجود ہیں، عبادت گزار ہیں مگر ذلیل ہیں، خوار ہیں، محتاج ہیں، لاوارث ہیں، تباہ حال ہیں، اسلام سے ناواقف ہیں ایمان سے خالی ہیں اور مردہ دل ہیں اس کا ثبوت مسلمانوں کے خیالات، کردار و حالات سے صاف ظاہر ہے۔

مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج

اب سوال یہ ہے کہ ان امراض کا علاج کس طرح ہوسکتا ہے۔خداوند کریم نے ان اقوام کو اس ارشاد سے مخاطب فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ط ﴿الرعد: 11﴾

''بے شک اللہ نہیں بدلتا کسی قوم کی حالت کو جب تک وہ نہ بدلیں جو ان کے جیوں میں ہے''

یہ وہ آیت ہے جس کو پڑھ کر علما وعظ سناتے ہیں لیڈر مضمون لکھتے ہیں اور لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ دنیا میں قومی عروج وترقی حاصل کرنے کے لئے وسائل اختیار کرو یعنی تجارت کرو، کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرو، تمدن اختیار کرو تاکہ مہذب وترقی یافتہ اقوام کی پیروی سے وہی کامیابی حاصل ہو۔مگر یہ معنی اس لئے سناتے ہیں کہ ان کے اپنے

دلوں میں یہی چیز ہے۔ **"اَلْاِنَاءُ یَتَرَشَّحُ مَافِیْہِ"** "برتن سے وہی چیز نکلتی ہے جو اس میں ہے"

بہر حال سمجھ کے موافق خیر خواہی پر عمل کر رہے ہیں مگر یہ نہیں سمجھتے کہ تمام اسباب اور اسباب کے نتائج بھی مشیئت ایزدی کے ماتحت ہیں۔ عرب اگر ان اسباب کو حاصل کر کے کسریٰ تک پہنچنا چاہتے تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ پہنچتے، ہرگز ممکن نہ تھا۔ ایک دل دنیا میں آیا جس نے لوگوں کے دلوں کو ماسویٰ اللہ کے میل ونجاست سے دھو کر صاف کر دیا لوگوں کے دل لوگوں کے خیالات بدل دیئے۔ پہلے نفس کے غلام تھے اب خدا کے عاشق اور خدا کے خادم ہو گئے۔ ان دلوں کے اندر خدائی نور خدائی طاقت عمل فرما ہوئی۔ اس تبدیلی سے نا اہل لوگوں کو خدا نے شہنشاہی کا اہل بنایا اور شہنشاہوں کو ان کا غلام بنا دیا۔ خداوند کریم کا ارشاد ہے کہ میں کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اس چیز کو نہ بدل ڈالے جو اس کے نفس کے اندر ہے۔ اس کے معنی سے صاف ظاہر ہے کہ خدا قوم کی ذلت کو اس وقت تک رفع نہیں کرے گا جب تک وہ اپنے نفس یعنی اپنے دل کے اندر کی چیز بدل نہ دیں گے۔

قلب اور نفس کی حقیقت

واضح ہو کہ نفس جس کا ذکر آیت مذکورہ میں ہے نفس اور قلب عالمِ باطن میں کامل ہیئت انسانی کا نام ہے۔ انسانی زندگی کی رفتار اس کے ماتحت ہے اور خداوند کریم کے نزدیک اعمال کی صداقت کا یہ معیار ہے اور ہمیشہ نفس قرآن شریف میں اسی قلب ہی کیلئے آیا ہے جیسے

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِیْفَةً وَّ دُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ لْغٰفِلِیْنَ﴿الاعراف: 205﴾

"اور اپنے پروردگار کو دل ہی دل میں عاجزی اور خوف سے اور پست آواز سے صبح وشام یاد کرتے رہو اور اس کی یاد سے غافل نہ ہونا"

وہ تبدیلی جو ارشاد الٰہی میں شرط مقرر کی گئی اس کی مثال اور اس کے نتائج کی مثال یہ ہے کہ خدا کی طرف سے کعبۃ اللہ کی بنیاد قائم کرنے کے لئے حضرت ابراہیمؑ کو حکم صادر ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ نے کعبۃ اللہ کی بنیاد اس مدعا پر قائم کی کہ تمام دنیا کے انسان خدا کی طرف متوجہ ہوں اور وحدہٗ لاشریک سمجھ کر اس کا یقین کریں اور اس کی عبادت کریں۔ چنانچہ لوگوں نے بتوں کو چھوڑا۔ غیر اللہ اشیاء کی پرستش سے توبہ کی اور خدا کی رحمت کے مستحق ہوئے۔ مگر تغیر زمانہ کے اصول جاری تھے۔ ان کے اثرات بھی اپنے وقت پر اس طرح نمایاں ہوئے کہ مسلمانوں ہی نے اسی کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بت لا کر نصب کئے اور ان کی پرستش شروع ہوئی۔ مدتہائے مدت تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ ہر سال لوگ آ کر طواف بھی کرتے تھے، بتوں کو بھی پوجتے رہے، تجارتیں بھی کرتے رہے، قومی نظام بھی قائم کرتے رہے، جنگ وجدال

کے اصول کے بھی کاربند رہے اور اطراف کی حکومتوں سے بھی تعلقات رکھتے رہے مگر کچھ بھی نہ ہوا۔ آخر وہ وقت آ گیا کہ خداوند کریم نے حضور سرور کائناتﷺ کو عالم احدیت سے بشریت میں لا کر مکہ میں پہنچایا اور حضور سرور کائناتﷺ نے بشر ہوتے ہوئے بشری اصول پر لوگوں کو حقیقی مالک کی طرف متوجہ کیا۔ حضور پاکﷺ نے لوگوں کے دلوں کو اور نفوس کو بدلا۔ ان کے دلوں کو نجاست سے پاک کیا۔ کعبہ کو بھی بتوں کی نجاست سے صاف کر دیا۔ لوگوں کے نفس کے اندر کی چیز کو اس طرح بدل دیا کہ نفس کی غلامی سے ہٹا کر خدا کی محبت اور غلامی میں لگا یا۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب جن کو دوسری اقوام جاہل جنگلی سمجھ رہے تھے ان سے بھی کم بضاعت کے لوگ جن کو رؤسائے قبائل **هم اَرَاذِلُنَا** کہتے تھے وہ لوگ شہنشاہ ہو گئے اور ہزار ہا برس کی مستقل حکومتیں ان کے آگے سرنگوں ہو گئیں اور صرف یہی چیز نہیں ملی بلکہ ان کا حقیقی مقصد بھی خدا نے پورا کیا اور وہ یہ تھا کہ وہ خدا سے واصل ہوئے۔ خدا ان سے راضی ہوا اور وہ خدا سے راضی ہوئے جن کے متعلق ارشاد ہوا۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُمۡ وَرَضُوۡا عَنۡهُ ﴿التوبة :100﴾

''اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے''

اب اس امر کو سمجھنا چاہیے کہ قرآن شریف نے انسان کو اسلام کی تعلیم دی جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ اسلام کی تکمیل کے بعد ایمان کی تعلیم دی جس کا تذکرہ کر دیا گیا ہے۔ اب قرآن شریف نے ایمان والوں کی تکمیل ایمان کے بعد تیسری تعلیم وہ دی جو اسلام اور ایمان کا نتیجہ ہے۔ یہ تیسرا حصہ تعلیم قرآنی ہے۔

3۔ درجۂ وصول الی اللہ

خداوند کریم نے قرآن شریف میں ارشاد فرمایا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡهِ الۡوَسِیۡلَةَ وَجَاهِدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِهٖ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿المائدہ : 35﴾

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو خدا سے ڈرتے رہو اور اس کا قرب حاصل کرنے کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کے راستے میں جہاد کرو تا کہ فلاح پاؤ''

اگر انسان ارکان وشرائطِ اسلام علمی و عملی پورے کر چکا ہو تو وہ مسلمان ہے اور مسلمان ہو کر شرائط ومنازل ایمان طے کر چکا ہو (جو تعلیم قرآنی کے دوسرے حصہ میں اوپر مذکور ہیں) تو وہ مومن ہے۔ اب خداوند کریم نے ان مومنوں کو اپنے دربار میں اپنے لقا کی دعوت دی ہے اور بتلایا ہے کہ اس میں وسیلہ اختیار کرو تا کہ خطایا سے بچ کر وصولِ حق تک پہنچ سکو۔ اس آیت شریف سے بعض لوگ صرف اعمال اور عبادات کو وسیلہ سمجھتے ہیں اور علمی

بلاغت ولفاظی سے یہی مدعا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔مگر ان کا خیال محدود اور ان کا بیان غلط ہے۔ ہر انسان اس کے مضمون پر غور کرنے سے اس کا مدعا سمجھ سکتا ہے۔اس کی مزید تشریح غیر ضروری ہے۔

جو لوگ اسلام میں داخل ہو کر اس درجہ کا ایمان حاصل کر چکے ہیں کہ اپنی زندگی آرام، دولت، عزت، جان نیز جذبات بھی مالک کی رضامندی پر قربان کر چکے ہیں۔اور خدا ان پر راضی ہوا۔ان کو اپنے دربار میں لقائے الٰہی کے واسطے دعوت دی یہ وہی صورت ہے کہ بادشاہ کی رعیت میں سے وہ لوگ جو بادشاہ کی نوکری اختیار کر کے بادشاہ کی عظیم الشان خدمات انجام دے چکے ہوں اور بادشاہ ان پر راضی ہو کر ان کو اپنے دربار میں اپنی ملاقات کیلئے دعوت دے اور شرف باریابی کے بعد اپنی طرف سے ان کو انعامات اور اپنے وسیع اختیارات عطا کرے۔اسی طرح مومنوں کو جنہوں نے ارشاد قرآنی کے مطابق

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴿المزمل:8﴾

''اور اپنے رب کا نام یاد کرو اور سب سے ٹوٹ کر اسی کے ہو رہو''

عمل کر کے اس آیت کی حقیقت پیدا کر لی۔ان کو اس کے نتیجہ میں یہ عطا کی کہ اپنی بارگاہ میں ملاقات (لقاالٰہی) کی دعوت دی،عظیم الشان اعزاز واکرام عطا فرمائے اور اپنے اختیارات اور تصرفات میں ان کو داخل کیا اب اس وصول ذاتی اور اس کے حقائق وتصرفات کو سمجھنے کے لئے اس تشریح پر غور کرنا چاہیے۔کہ انسان فی الحقیقت ہر وقت واصل باللہ ہے جیسے کہ ارشاد قرآنی ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴿ق:16﴾

''اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے زیادہ نزدیک ہیں''

اب انسان کی ذات خود اور وہ مخلوق جو ماسویٰ اللہ میں داخل ہے ذات الٰہی کے حجاب ہیں۔اور حقیقت اپنی بھی اور نیز اس کے علوم اور اعمال بھی اس کے حجاب ہیں۔یہ حجاب دو قسم کے ہیں ایک قسم وہ ہے جس کو ابتدائے اسلام اور ایمان سے روگردانی ہو جس کے متعلق حکم ہوا۔

فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴿يٰسٓ:9﴾

''پس ہم نے انہیں اوپر سے ڈھانک دیا تو انہیں کچھ نہیں سوجھتا''

یہ حجاب واصل جہنم ہونے کا ذریعہ ہے مگر دوسرا حجاب اپنا نفس اور اس کے اشغال ہیں یہ حجاب خود اسلام اور ایمان کی تکمیل کے بعد معدوم ہو سکتے ہیں جن کا شرک آفاقی اور شرک انفسی میں ذکر ہو چکا ہے۔

چونکہ ایمان کی تکمیل عبادتِ الٰہی کے ذریعہ سے ہی ہوسکتی ہے اس لئے عبادت الٰہی جب الفاظ سے گزر جائے اور موضوع ومعانی پر پہنچ جائے تو الفاظ متروک ہوجاتے ہیں۔ چونکہ معانی اوران کے موضوع کا تعلق ذات باری تعالیٰ کی صفات سے ہے اس لئے اب یہ انسان عبادت الٰہی کے موضوع سے صفات باری تعالیٰ تک واصل ہوتا ہے اب جس اصول اور جس سبیل پر مجاہدہ کرنے سے موضوع تک رسائی ہوئی اسی رفتارِ عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان دائرہ مخلوق سے خارج ہوتا جائے گا اور اپنی ذات انسانی بھی مستغرق فی الذات ہوکر اس کی بھی نفی ہو جائے گی اور عبادت وغیرہ جو اسباب عروج یا اسباب وصول تھے یا وہ علوم جن سے ایمان کی تکمیل ہوئی اور وہ اخلاص اور وہ علوم جو ذریعہ وصول الٰہی ہے وہ چونکہ مخلوق تھے اور اب اس دائرہ امکان اور مخلوق سے علیحدہ ہونے کا وقت آیا اس لئے سب کی نفی ہوجائے گی اور جب تک انسان کو کسی چیز کا علم ہے وہ عالم ہے وہ عابد ہے اور دائرہ امکان میں داخل ہے اور جب یہ حجابِ علم معدوم ہوگا تو نہ عابد ہے نہ معبود ہے نہ عبادت ہے نہ زبان ہے نہ جہان ہے نہ عدد ہوگا۔ اس کی مثال یہ ہے جس طرح چپلی پہن کر دریا تک پہنچے تو چپلی اتار کر دریا میں غوطہ لگا دیا یا موٹر وغیرہ سواری تیز رفتار کے ذریعہ کسی مکان پر پہنچے تو موٹر چھوڑ کر مکان میں داخل ہو گئے۔ الغرض سب اسباب اور سب علوم معدوم ہوجاتے ہیں۔

حضرت مولانا نظامیؒ نے فرمایا:

ہم بچشم یار بینیم یار را

حضرت مولانا جامیؒ نے اس مقام کے اثر میں آکر بے ساختہ اشعار کہہ دیے۔

در دور زماں جز من کیست

در کون و مکاں جز من کیست

حضرت بایزید بسطامیؒ کو جب اس طرف کا پردہ ہٹایا گیا تو بے ساختہ، بے اختیار ہوکر کہہ دیا۔

سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَانِیْ

الغرض وصول ذات کے بعد انسان کو صفات الٰہی کی سیر واقع ہوتی ہے اور صفات میں سے ہر صفت کا مقام علیحدہ خاصیت رکھتا ہے۔ جس صفت ذاتی کا مشاہدہ ہوا س کا اثر اور اسی کی خاصیت کا پرتو اس انسان کے اندر آتا ہے جیسے کہ صفاتِ الٰہی ہیں۔ دو صفات ایسے ہیں جن کے ذریعہ دنیا کے تمام تغیرات ہوتے ہیں اور ہر چیز اسی سے وجود میں آتی ہے۔ یہ ہیں ''القابض'' اور ''امر تکوین'' جو من قبیل کن فیکون ہیں۔ اگر کسی انسان کو القابض کے مقامِ اسرار ''القبض''، پر رسائی ہوجائے خواہ ایک لمحۃ البصر ہی کے انداز پر ہو تو اس انسان کو یہ عزت ملتی ہے کہ وہ اگر مردہ کو حکم دے

تو زندہ ہو جاتا ہے اور زندہ کو حکم دے تو وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبد القادر جیلانی غوث الثقلینؒ کو اسرار القبض کے انکشافات ہونے پر ان کو وہ عزت اور تصرف عطا ہوا جو اس مقام کی خصوصیات سے ہے جس کے متعلق حضرت شیخ نے اس کو ان اشعار میں ظاہر کیا:

وَاَطْلَعَنِیْ عَلٰی سِرٍّ قَدِیْمٍ وَقَلَّدَنِیْ واَعْطَانِیْ سَؤَالِی

''اور مجھے اپنے ازلی راز اور قدیمی بھید پر آگاہ کیا اور مجھے مامور فرمایا اور میری آرزو یا میرے سوال کو پورا فرما دیا''

وَلَو اَلْقَیْتُ سِرِّیْ فِیْ بِحَارٍ لَصَارَ الْکُلُّ غَوْراً فِی الزَّوَالٖ

''اور اگر میں اپنے بھید کو دریاؤں (سمندروں) پر ڈال دوں تو وہ تمام خشک ہو کر زوال پذیر ہو جائیں''

وَلَوْ اَلْقَیْتُ سِرِّیْ فَوْقَ مَیْتٍ لَقَامَ بِقُدْرَۃ المولٰی تَعَالِیْ

''اور اگر میں اپنے راز کو مردہ تن یا مردہ دل پر ڈالوں تو وہ بلاشبہ رب العزت کی قدرت سے زندہ کھڑے ہو جائیں''

الغرض انسان جب بشریت سے خارج ہو کر ذاتِ حق کے ساتھ واصل ہوا اور اس کو فقدان کلی حاصل ہو جائے تو یہ وصلِ تام ہے۔ جس طرح حباب و بلبلہ دریا سے ظاہر ہوا تھا اور پھر اسی میں محو ہو گیا۔

نیابت رسول ﷺ

اب یہ انسانی حیثیت میں جب واپس آتا ہے تو اس کے سینہ میں وہی اسرار و مضامین رنگیں موجزن ہوتے ہیں جو حضرت رسول کریم ﷺ کی حقیقتِ محمدیہ کے عکس ہوتے ہیں اور اس شخص کی زندگی ان اسرار و انوار کے ماتحت حضرت رسول کریم ﷺ کی نیابت میں گزرتی ہے اور عوارضات و تاثرات بشری اس ملکیت و نورانیت کے ماتحت ہوتے ہیں اور ہر فعل بشری عبادت میں داخل ہوتا ہے اور مشیّت ایزدی کے ماتحت اس کے حرکات و سکنات ہوتے ہیں۔ جو کچھ مالک کی مرضی ہو وہ اس کے ارادہ میں آتا ہے اور جو اس کے ذہن میں آتا ہے وہ مالک کو منظور ہوتا ہے اور اس کی منشاء منشائے الٰہی سے واثق ہوتی ہے۔

تکوین

اس منزل پراس کوامرتکوین (جومن قبیل کن فیکون ہے) سے عزت ملتی ہےاسی طاقت سے دنیاوی معاملات اس کے تصرف میں آ جاتے ہیں اسی طاقت کا اظہار اس میں ہوا جس کے متعلق ارشاد ہوا۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ج ﴿الانفال:17﴾

''اوراے محبوب وہ خاک جوتم نے پھینکی تھی وہ تم نے نہیں پھینکی بلکہ اللہ نے پھینکی تھی''

درحقیقت اس حالت میں آ کرانسان کی زندگی کی حیثیت فرع کی ہوتی ہےاوراس کا اصل ذات حق متصور ہوتا ہےاس کیفیت کا اظہار

لِیْ مَعَ اللّٰهَ وَقْتُ ' لايَسَعُنِیْ فِيْهِ مَلَکُ ' مُّقَرَّبُ ' وَلَا نَبِیُّ مُّرْسَلُ ' ﴿الحديث﴾

''میرے لئے قرب ذاتی میں ایساوقت بھی ہے جب کسی مقرب فرشتے اور نبی مرسل کی رسائی نہیں ہوتی''

کی حدیث میں مفصل اس طرح ہوا کہ حضور سرور کائناتﷺ ایک دن اپنے حجرہ خاص سے باہرتشریف لائے تو آ گے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کھڑی تھیں۔حضورﷺ نے فرمایا کہ **مَنْ اَنْتِ** حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس سوال پرسخت حیران ہوئیں اوراز روئے ادب جواب عرض کیا کہ **اَنَا بِنْتُ اَبُوْبَكرِن الصِّدِّيْق** اس پرحضورﷺ نے فرمایا کہ **مَنْ اَبُوْبَكر**۔اس پرسخت حیرت واضطراب پیدا ہوگیااورلرزہ پیدا ہوگیا مگرادب کوملحوظ رکھ کرعرض کی کہ **هُوَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰه**۔اس پرآپ نے فرمایا **مَنْ رَسُوْلُ اللّٰه**۔اب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہوش وحواس معدوم ہو گئے اور زمین پر گر پڑیں۔ بہت دیر کے بعد حضورﷺ حالت بشری میں آئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس جا کران کوفرمایا کہ اے عائشہ تم کو کیا ہوا زمین پر کیوں بے ہوش پڑی ہو۔اس پرحضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ہوش واپس آیا۔مگر تعجب بھی بے حد ہوا اور قصہ بیان کر دیا۔ اس پرآپ نے فرمایا کہ **لِیْ مَعُ اللّٰهِ وَقْتُ ' اِلٰی آخره**۔

جواس مقام پر بلائے گئے اور پہنچےان کے فضائل اوراکرام امکان تحریراورتقریر سے باہر ہیں خدا ان کو جانتا ہےاوروہ خدا کو جانتے ہیں۔

الغرض یہ ایک مقام ہے کہ یہاں پہنچ کرانسان کی حقیقت بدل جاتی ہےاور مافوق العادت حیثیت حاصل ہوتی

ہے اور تصرفاتِ الٰہی اس کے عمل سے ظاہر ہوتے ہیں یہ وہی حیثیت ہے کہ جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود پر غالب آئے، یہ وہی چیز ہے جس سے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام فرعون پر غالب آئے، یہ وہی چیز ہے جس سے حضرت عیسیٰ روح اللہ علیہ السلام نے مردے زندہ کئے، یہ وہی چیز ہے جس کو حاصل کرنے کے بعد انسان کو نبوت و رسالت ملتی ہے اور آسمانی کتاب ملتی ہے اور یہ وہی حقیقت ہے جس سے ایک یتیم (حضرت محمدﷺ) تمام روئے زمین کا حقیقی حاکم ہوا اور آسمانوں پر تمام ملائک کا سردار ہوا جس سے اس یتیم نے تمام دنیا کو نورِ الٰہی سے روشن کر دیا۔ بادشاہوں کو غلام کر دیا۔ غریبوں کو بادشاہ بنا دیا۔ وہ یتیم اس سے خدا کا دوست ہو گیا۔ اور اس درجہ کو پہنچا کہ اس کی ذات خدا سے مل گئی۔ اس کی عزت خدا سے مل گئی۔ اس کا نام خدا سے مل گیا۔ کلمہ طیبہ کامل نہیں ہوتا جب تک اس کا نام اس سے ملایا نہ جائے۔ بہشت کے دروازے نہیں کھلتے جب تک اس کا نام نہ لیا جائے۔ اس کی تابعداری اس کی محبت خدا کی تابعداری اور خدا کی محبت ہے۔ حضرت نظامیؒ نے فرمایا **''یتیمے نگرتا کے شاہی گرفت''**

حقیقت سلوک وطریقت

واضح ہو کہ یہ تمام تحریر ابتداء سے اخیر تک راہِ طریقت کے نشانات ہیں۔ اگر ان کے متعلق تشریح کی جائے تو کئی کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ یہ صرف اس لئے لکھا گیا کہ لوگوں کو اصلی طریقت کا موضوع معلوم ہو جائے اور ''اسلام، ایمان اور نتائج ایمان'' کو سمجھ کر اپنا مطمحِ نظر درست کر سکیں۔

اب اکثر لوگ ایسے بھی موجود ہیں جو باوجود تعلیم یافتہ ہونے کے اس حقیقت مذکورہ کے خلاف اور ایک علیٰحدہ چیز کو طریقت اور سلوک سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض سالک اور صوفی نما لوگوں نے اور علما نے اسی مغالطے کے اندر کتابیں بھی لکھی ہیں اور حقیقت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے اقسام بنائے ہیں۔ کہ طریقت، شریعت، معرفت، حقیقت کی علیحدہ علیحدہ تفصیلات قائم کر لی ہیں۔ نہ صرف جہا ل ہی بلکہ خاص طبقہ کے لوگ بھی اس غلطی میں شامل ہو گئے۔ خاص لوگوں کی کتابوں میں یہ ثابت ہے۔ مگر ایک حقیقت آگاہ شخص کی نگاہ ان فروعات اور خود ساختہ، خود کاشتہ شے سے گزر کر اصلیت پر ضرور پہنچ سکتی ہے خواص نیک لوگوں کی ذہنی اور کشفی غلطی یا فروعی تصورات سے غلط لوگوں نے ایک ایسا برعکس اور غلط پہلو اختیار کر لیا ہے کہ وہ شریعت اور طریقت کو علیٰحدہ علیٰحدہ اور دو متضاد دو مخالف چیزیں قرار دیتے ہیں۔ اور شیطان کو ان لوگوں سے اس حد تک امداد ملی کہ راستہ ہی شریعت اور دستور العمل رسولﷺ کے خلاف قائم کر دیا گیا۔ اور مدعیانِ معرفت وطریقت کے ایسے وجود پیدا ہو گئے کہ اہلِ دین اور علماء کو تو ایک لغو، بیہودہ اور بے معنی سمجھنے لگے اور اہل علم اور علما کو لغو سمجھ لینے سے خود دین اور اسلام کو بھی لغو سمجھنا شروع کیا جیسا کہ اس مضمون کی ابتداء میں

مسئلہ تجدد امثال کے قانون پر تغیر کلی کا مسئلہ لکھا گیا۔ یہ تمام تغیرات ذہنی، عملی اور علمی اس تغیر کلی کے اصول کے نتائج ہیں۔ جو چیز خدا سے ملانے والی خدا اور رسول ﷺ نے عطا کی وہی خدا اور رسول ﷺ سے علیحدہ اور مخالف کرنے کا سبب ہوگئی۔ جس طرح کہ اُسی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد نے کعبتہ اللہ میں تین سو ساٹھ بت لا کر رکھ دیئے تھے جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو نابود کرنے کے لئے خدا کی طرف سے یہ مقام بنایا تھا۔ الغرض اب اکثر لوگ ایسے ہیں جو عبادت بھی اور علم بھی طمعِ نفسانی کے لئے اختیار کرتے ہیں۔

بہ بیں تفاوت راہ از کجا ست تا بکجا

ضرورتِ شیخ

واضح ہو کہ تمام طریقت کا ہر مرحلہ ہر کام سوائے رہبر اور مرشد کے اور پیر طریقت کی پیروی کے ہرگز ممکن نہیں۔ ایک رسیدۂ باخدا انسان جو نائبِ رسول ہو اور وہ انسان کو اس سبیل کی رہنمائی کر سکتا ہو، اس کے لئے حکم ہوا۔

وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ج ﴿لقمٰن: 15﴾

''اور اس کی راہ چلو جو میری طرف رجوع لایا''

اس امر کے دلائل پیش کرنے یا اس بحث کو ثابت کرنا تحصیل حاصل ہے۔ تعلیم طریقت، سبیل معرفت خود ہی رہبر حقیقی کی مقتضی ہیں۔

حقیقی رہبر کی پہچان

اب سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ایک سادہ ناتجربہ کار انسان سینکڑوں غلط اور مجازی پیروں سے حقیقی رہبر کو کس طرح پہچان سکتا ہے۔ اس لئے کسی قدر یہ معاملہ واضح کیا جانا ضروری ہے۔ اوّل تو پہچان کا اصول یہ ہے کہ اگر واقعی طالبِ حق ہے تو اس کی صداقتِ خواہش اور تمنا خود ہی کافی معیار ہے اس لئے کہ ایک پیاسے شخص کو پانی کی شرائط اور بحث کرنا غیر ضروری ہے تاہم قرآن شریف نے بھی اس مشکل کو اس طرح حل کر دیا ہے کہ نائب رسول اور ولی اللہ وہ شخص ہے جس کی زندگی تین امور کی کاربند ہو۔

1۔ **وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿النجم :3﴾**

''اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتا''

2۔ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿التوبۃ: 128﴾

''اس پر تمہارا مشقت میں پڑنا گراں ہے تمہاری بھلائی کا نہایت چاہنے والا اور ایمان والوں پر نہایت شفیق مہربان ہے''

3. تَخَلَّقُوا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ ﴿الحدیث﴾

''اپنے اخلاق کو اخلاقِ الٰہی سے موصوف کرو''

اس پر حضور سرور کائناتﷺ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ولی وہ شخص ہے جس کے پاس بیٹھنے سے خدا یاد آئے۔ یعنی حبِّ دنیا کی جگہ دل میں خدا کی محبت داخل ہو۔ لیکن اگر یہ حقیقت نمایاں نہ ہو تو ایسے شخص کو خدا کا ولی نہیں بلکہ شیر قاتل سمجھ کر اس سے بھاگنا چاہیے۔ **نعوذ باللہ من ذالک**

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں سب مشکلات سے بڑھ کر مشکل یہ ہے کہ خدا سے ملانے والا رہبر ملے اور اگر یہ مل گیا تو دنیا و مافیہا کی دولتیں اس کے آگے ہیچ ہیں۔ اس رہبر کا ملنا ہی عین کامیابی ہے۔ مالک الملک نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿الکھف:17﴾

''جس کو اللہ ہدایت دے وہ ہدایت یاب ہے اور جس کو اللہ ہدایت نہ دے اس کے لئے کوئی ولی اور مرشد نہیں''

اس سے ثابت ہوا کہ جس کو اپنی بارگاہ میں بلانا ہوتا ہے اسی کو مرشد عطا کرتے ہیں۔

اس موقع پر یہ سمجھنا ضروری ہے کہ طریقت میں باخدا رہبر نسبت رسولﷺ کی تعلیم و تربیت علمی و عملی اور تبدیلیِ خیالات اور ذہنیت کی درستی اور اصلاح مقصود ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ برگزیدۂ خدا ولی اللہ کی قبر پر جا کر بیٹھ جانے سے منازل طے ہو جائیں۔ یہ ناممکن ہے۔ اگر یہ ہو سکتا تو حضرت رسول کریمﷺ خود حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قبر پر گوشہ نشین ہوتے۔ غارِ حرا میں جا کر مراقب نہ ہوتے اور اگر قبر سے ہی ہدایت ممکن ہوتی تو بس قبر ہی کافی تھی۔ کسی پیغمبر کے مبعوث کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ زیارتِ بزرگان ترقیٔ محبت و یادِ بزرگان اور ان کی زندگی یاد کر کے ان سے اپنے اعمال کی مطابقت کرنا بہتر اور مفید ہے۔ لیکن جہاّل کی طرح زیارتوں کا طواف کرنا یا اُن سے سوال کرنا غلطی ہے اور ممنوع ہے۔ البتہ ان کی روح کے طفیل خدا سے سوال جائز ہے۔

نوٹ اس خصوصی خطبہ کے پیش کرنے کی سعادت مؤلف ہذا کو حاصل ہوئی۔ **الحمد للہ علی ذالک** (مؤلف)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطبہ مجلس کبریٰ

عرس شریف جون 1959ء

فرمایا: تمام حاضرین جو اس وقت حاضر ہیں یہ تمام اسی طرح ایک روز خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔ ہم بھی ہوں گے۔ ہمیں فکر یہ چاہیے کہ ہم بھی تمہارے متعلق شرمندہ نہ ہوں اور نہ آپ ہماری وجہ سے شرمندہ ہوں۔

آپ خدا کے دروازے پر امید اور طمع لے کر آئے ہیں۔ ہر شخص تکلیف زدہ ہے، البتہ اس کی ذاتی تکلیف کی نوعیت جدا جدا ہے۔

پہاڑ کا یہ راستہ دشوار گزار ہے آپ تکلیف کر کے اس جگہ آئے ہیں۔ پیغمبروں اور اولیاء اللہ نے بھی پہاڑ پر جا کر دعائیں کی ہیں۔ معلوم ہوا کہ پہاڑ پر جا کر دعا کرنے میں اس کی قبولیت میں خاصا اثر ہوتا ہے۔

مسلمانوں کا عمومی دستور ہے کہ وہ مختلف مجالس کا انعقاد کرتے ہیں مگر حقیقت ان میں نہیں ہوتی۔ عمومی مقصد یہی ہوتا ہے کہ مخالف گروپ کے خیالات کی مذمت کی جائے۔ اُسے بدعتی اور اسلام سے خارج ثابت کیا جائے۔ مگر ہماری یہ مجلس ایسی تمام باتوں سے بری ہے۔ ہماری اس مجلس میں مقرر صاحبان نے اچھی طرح مسائل کو بیان کیا ہے اور کسی دوسرے کی مذمت بھی نہیں کی۔ یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیے اور عرس شریف کا موضوع بھی یہی ہے۔

فرمایا: آپ کو میرا درجہ بخوبی سمجھ لینا چاہیے میرا درجہ ایک بے جان بوسیدہ لکڑی کا ہے جو اپنے مالک کے ہاتھ میں ہے جس سے وہ اپنے دروازے کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ میرا دروازہ ہے جہاں سے تمام حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ ضروری ہے کہ اپنا باطن مالک سے ملا ہوا رکھیں تا کہ نورِ ربانی آپ کے اندر سرایت کرے اور مالک الملک کی رضا حاصل ہو جائے اور آپ کی ساری مشکلات کا مداوا ہو سکے۔

فرمایا: آسمانوں اور زمین میں تمام مخلوق اللہ کی عبادت میں ہے **يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** (جو چیز آسمانوں میں ہے اور جو چیز زمین میں ہے سب خدا کی تسبیح کرتی ہے)

خنزیر بھی اپنے طریقے سے عبادت کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز انسان کی خاطر پیدا کی ہے اور انسان کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ** یعنی جنّ وانس کی پیدائش کا مقصد بھی اللہ تعالیٰ کی عبدیت اختیار کرنا ہے۔ بوتل کی اپنی کوئی قیمت نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر کی چیز کی قیمت ہوتی ہے خواہ وہ شربت ہو، عرق ہو یا شراب اور دوائی وغیرہ۔ چنانچہ اس بوتل کو بھی اس کے اندر کی چیز کے نام سے ہی پکارا جاتا ہے۔

اسی طرح انسانی وجود کا حال ہے اگر خوش قسمت انسان کا رسولِ خداﷺ کے صدرِ مبارک سے صحیح تعلق (نسبت رسولیﷺ) ہو جائے تو اسے قیمتی چیز حاصل ہے اس کا باطن نوری حقیقت کا ظرف ہو جاتا ہے اور وہ انسانی وجود قیمتی ہوتا ہے ورنہ وہ بے فائدہ اور بیکار ہے۔

بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اکثر لوگوں نے حیات النبیﷺ کے مسئلہ کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کر رکھی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورﷺ کی وفات اور حیات کا مسئلہ ہی پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ حضور انورﷺ کی مثال ایسی ہے کہ ایک بلند و بالا عرش الٰہی تک نورانی ستون ہو جس پر ایک نورانی ہستی تشریف فرما ہو اور وہ ستون گندی اور غلیظ دنیا میں نصب شدہ ہو جس میں غلیظ اور گندگی میں غرق مخلوق موجود ہو تو اس نورانی ہستی کو اس کا مالک حکم دے کہ آپ اس ستون سے نیچے اتر کر جائیں اور ان غلیظ لوگوں کو گندگی سے پاک وصاف کریں تو ظاہر ہے کہ وہ نورانی ہستی اپنے مالک کے فرمان کے بموجب نیچے آئے گی تاکہ اس مخلوق کو پاک وصاف کرے۔ چنانچہ ان میں سے جو خوش قسمت انسان اس نورانی ہستی سے اپنا تعلق پیدا کر لیں گے وہ فلاح یاب ہوں گے اور یہ نورانی ہستی ان کو محبت سے پیار وشفقت سے اپنے مالک کی طرف مدعو کرے گی اور پھر وہ نورانی ہستی تکمیل فرمان اور معینہ وقت کے بعد اپنی نورانی جگہ پر واپس چلے جائے گی۔

اس مسئلے کو اس مثال سے سمجھ لینا چاہیے۔ سرورِ دوعالمﷺ اللہ کے رسول اور اس کے محبوب ہیں وہ نور ہیں اور وجہِ تخلیق کائنات ہیں۔ وہ دنیا میں تشریف لا کر مخلوق خدا کو خدا کی غلامی کا رستہ سکھا کر واپس تشریف لے گئے۔ اس میں ان کی موت وحیات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

موہڑہ شریف میں آپ لوگوں کے آنے کا مدعا یہ ہونا چاہیے کہ راستے اور یہاں ٹھہراؤ کی دشواریوں سے خواہ وجود خاک بھی ہو جائیں مگر دل زندہ ہو جائیں۔ یہاں سے اللہ کے بندے بن کر جائیں اور نسبت رسولیﷺ حاصل کریں اور ضیائے ربانی سے مالا مال ہو کر جائیں اور اسی پر اپنی رفتارِ زندگی قائم رکھیں۔

خطبہ کے اختتام پر جامع دعا فرمائی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ مجلس کبریٰ

عرس شریف نومبر 1959ء

فرمایا: عرس شریف پر آنے کے خیال کو صحیح کرنا چاہیے اس خیال سے نہیں آنا چاہیے کہ وہاں میلہ ہوگا اور گھوم پھر کر تماشہ دیکھیں گے۔ پہاڑ کی بھی سیر ہوگی۔ بلکہ عرس کی حقیقتِ اصلی اور اس کا موضوع بھی سامنے ہونا چاہیے۔

فرمایا: لفظ عرس مادہ ہے جس سے دوسرے الفاظ مثل عروس، عروسہ، عرایس وغیرہ مشتقات ہیں۔ جیسے ایک گھر میں بچی پیدا ہوتی ہے، وہ جوان ہوتی ہے، اس کی تربیت اور آسائش کے سامان ہوتے ہیں، والدین اور برادران موجود ہوتے ہیں اور پھر اس کی شادی ہوتی ہے۔ اسے گھر سے خزانہ دیا جاتا ہے، پھر جتنی بار بھی وہ اپنے میکے (اصلی گھر) آتی ہے تو اسے خزانہ دیا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے جب مریدین اپنے گھر یعنی مقام عرس پر حاضر ہوتے ہیں تو ان کو اصلی نعمتِ روحانی سے حصہ دیا جاتا ہے۔

فرمایا: عرس غار حرا میں حاضری کی نقل ہے۔ رسول خدا ﷺ وہاں اکیلے تشریف لے جاتے تاکہ نوری حقیقت کو حاصل کریں۔ یہ جگہ مکہ شریف میں جبل نور پر نہایت ہی دشوار جگہ پر واقعہ ہے وہاں اس غار میں کئی کئی دن حضور اکرم ﷺ گوشہ نشینی فرماتے۔ جب اس ایک ہستی کو وہ نوری حقیقت کا حصول ہو گیا تو جو بھی ان کے ساتھ باتعلق ہوا اس کو بھی اسی نعمت سے حصہ ملتا گیا۔ پھر وہ ایک کثیر مجمع کے ساتھ عرفات میں جمع ہوئے۔ اس سالانہ اجتماع کو حج کہا گیا۔ مقامی جگہوں پر عرائس کی مجالس اس سالانہ اجتماع حج کی نقل قرار پائیں۔

بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا: دوسرے الفاظ نماز، روزہ، زکوۃ، حج وغیرہ کی اصلی غایت لوگوں کے ذہنوں میں جیسے بدل گئی ہے ویسے ہی لفظ عرس کا موضوع بھی بدل گیا ہے۔ عرس کا اصلی موضوع یہ تھا کہ نورانی حقیقت کو حاصل کیا جائے۔ اس کے برعکس آج کل عموماً عرائس خرافات کا نمونہ بن گئے ہیں۔ ناچ گانے، رنگین پروگرام اور دنگا فساد کے اکھاڑے بن گئے ہیں اور اصلی چیز گم ہوگئی ہے۔ لاہور کے چند افراد کا واقعہ بیان فرمایا کہ وہ جب عرس کے

موقع پر یہاں آئے اور یہاں ذکر کی محفلیں دیکھیں تو وہ فوراً واپس چلے گئے کہ اس جگہ تو عرس والی کوئی بات ہی نہیں۔ یہاں تو کوئی بھی رنگین پروگرام نہیں ہوتا۔

فرمایا: ایک بیج بویا جاتا ہے تو اس سے درخت اُگ کر بڑا ہو جاتا ہے تو اس سے ہزار ہا بیج تیار ہوتے ہیں جیسے اخروٹ یا بادام کا درخت۔ اسی طرح اگر کوئی شخص عرس میں اپنی رفتارِ زندگی کو درست کرنے کی نیت سے حاضر ہوتا ہے تو وہ صحیح مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اللہ والوں سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ صحیح تعلق پیدا کر کے اپنی رفتار زندگی درست کر لیتا ہے۔ فرمایا **هُمْ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ** یعنی اللہ والوں کے پاس بیٹھنے والا بدبخت نہیں رہتا۔ چنانچہ ایسے شخص کو بھی حصہ مل جاتا ہے۔

فرمایا:عرس شریف پر حاضری کا وقت بہت قیمتی ہے اسے ضائع کرنا سخت غلطی ہے۔ مسائل شریعت اور طریقت کو سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ذکر و فکر سے اپنے باطن کو درست کرے تا کہ اس کا باطن رسول اللہﷺ سے پیوست ہو جائے اور مضامین رنگیں کا ورود ہونا شروع ہو جائے۔ اسی سے ذاتِ الٰہی کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ یہاں سے فارغ ہو کر جب آپ اپنے گھروں کو واپس جائیں تو اپنے قلوب کو حاصل کردہ تعلیمات پر مستقیم رکھیں۔ اسی سے آپ کی رفتارِ زندگی درست ہوگی اور آپ انشاءاللہ کامیاب ہو جائیں گے۔

آخر میں اعلیٰ حضرتؒ نے نہایت جامع دعا فرمائی۔

☆

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
اُس کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اَور جمعیت ہوئی رخصت تو ملّت بھی گئی
(اقبال)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبہ مجلس کبریٰ

عرس مبارک 25 جون 1960ء

سال 1960ء کے اوائل ہی سے غوث المعظمؒ کی طبیعت مبارک علیل تھی جس کی شدت ماہ جون میں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ سالانہ عرس شریف کا انعقاد 23 تا 25 جون مقرر تھا۔ چنانچہ 25 جون کو جب مجلس کبریٰ (گیارہ بجے تا اڑھائی بجے بعد دوپہر) کا پروگرام طے پایا تو گرمی شباب پر تھی اور کم و بیش ایک لاکھ انسانوں کا جم غفیر شمولیت کے لئے حاضر تھا۔

چونکہ مجلس کبریٰ کی کاروائی کا انتظام مؤلف کتاب ہٰذا کے ذمہ تھا لہٰذا میں نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر ایک شامیانہ نصب کرنے کی اجازت طلب کی تاکہ حضور والا شان کی نشست گاہ پر سایہ کا انتظام ہو سکے مگر حضورؒ نے فرمایا کہ شامیانہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنے تمام سنگیوں (رفقاء و مریدین) کے ساتھ ہی بیٹھوں گا۔

چنانچہ اسی حکم کے مطابق مجلس کبریٰ کی معمول کی کاروائی شروع ہوئی۔ تلاوت قرآن حکیم، شجرہ شریف، نعتیہ کلام، قصائد اور چند تقاریر جاری ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اس شدت کی گرمی میں تقریباً ایک لاکھ کے مجمع میں مکمل سکوت تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے اور پھر اَبر کا ایک ٹکڑا آسمان پر نمودار ہوا اور کاروائی کے دوران ہی ہلکی بونداباندی بھی ہوئی۔ جس سے گرمی کی شدت میں خوشگوار تبدیلی آ گئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تھی۔ معمول کی کاروائی کے اواخر میں غوث المعظم رہبرِ اعظم طریقت نسبت رسولیﷺ نے خطاب فرمایا:

ایک دن ایسا آنے والا ہے جب آج کی طرح ہم سب خداوند کریم کے دربار میں حاضر ہوں گے جب اپنے اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا اور اس کا پورا پورا بدلہ پائیں گے۔ فرمان الٰہی ہے:

وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ قف ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا کَسَبَتۡ وَھُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿البقرۃ:281﴾

''اور اس دن سے ڈرو جبکہ تم خدا کے حضور میں لوٹ جاؤ گے اور ہر شخص اپنے اعمال کا پورا پورا بدلہ پائے گا اور کسی کا کچھ نقصان نہ ہوگا''

فرمایا: آج کی مجلس میں چند تقریریں بھی ہوئیں۔ ان تقریروں کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ آپ محض تقریریں سننے نہیں آتے یہاں آنے کا اصل مقصد حاصل کرنا چاہیے۔ اصل مقصد نسبت رسولﷺ کا حاصل کرنا ہے۔ لہذا پوری کوشش سے آپ طریقت نسبت رسولﷺ کو سمجھیں اور اس پر کاربند ہو جائیں۔ اس کارروائی سے آپ اللہ کے بندے قرار پائیں گے اور آپ کی دینی اور دنیاوی مشکلات حل ہوں گی۔

فرمایا: اہم سوال یہ ہے کہ بزرگی کیا چیز ہے؟ بزرگی کوئی کتاب نہیں کہ کھول کر آپ کے سامنے رکھ دی جائے اور آپ اسے پڑھ کر بزرگ بن جائیں۔ بزرگی مرشدِ کامل اور مرید کا پرخلوص تعلق ہے۔ اگر وہ قائم ہو جائے تو مرید اگر ہزار میل پر بھی ہو تو اسے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

فرمایا: میں نے ہر اس شخص کی خدمت کی ہے جو میرے پاس آیا۔ خواہ وہ کسی علاقے سے تعلق رکھتا تھا، کسی رنگ و نسل کا تھا۔ چنانچہ میرے پاس پاکستان، ڈھاکہ (بنگال) اور بیرون ملک سے اعلیٰ اور ادنیٰ اصحاب آئے اور میں نے ان سب کی خدمت کی ہے میرے قرب و جوار کے ہمسائے اس بات پر گواہ رہیں کہ میں نے ان سب کی بلکہ ان کے جانوروں تک کی ہمیشہ خدمت کی ہے۔ میں نے طریقت نسبت رسولﷺ کو سمجھا ہے، سیکھا ہے، جس طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اور حضرت عمر فاروقؓ نے اور دیگر صحابہ کرام نے سیکھا اور عمل پیرا ہوئے۔

فرمایا: آج کل طریقت کے معروف سلاسل اربعہ یعنی قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ ہیں۔ ان سلاسل کے بانیوں نے نہ تو ان سلسلوں کے نام رکھے اور نہ خود ایسا کہلائے۔ حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے کبھی اپنے آپ کو قادری نہیں کہلوایا۔ نہ ہی حضرت ابو اسحاق شامیؒ نے اپنے آپ کو چشتی کہلوایا۔ شیخ الشیوخ حضرت شہاب الدینؒ نے کبھی اپنے آپ کو سہروردی نہیں کہا اور نہ ہی حضرت خواجہ بہاؤ الدینؒ نے اپنے آپ کو نقشبندی ٹھہرایا۔ بلکہ ان سب کا بنیادی مسلک نسبت رسولﷺ ہی تھا اور یہی مرکزی دائرہ ہے جس میں اصحاب کرام، تابعین، تبع تابعین اور اولیائے کرام قائم رہے۔ مختلف سلاسل طریقت کے نام بعد میں آنے والے ان کے متبعین نے مقرر کر لئے اور انہی سلاسل کو مقصود بالذات سمجھ لیا اور مرورِ زمانہ کے باعث ان میں عصبیت راہ پا گئی۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے لگے، بلکہ دوسروں کی تحقیر کرنے لگے۔ اس طرح طریقت جو اصل میں باہمی محبت، پیار اور ہم آہنگی کا ذریعہ تھی، وہ مغائرت کا سبب بن گئی۔ لہذا موجودہ سلاسلِ طریقت میں اگر نسبت رسولﷺ قائم رہے تو درست ہیں ورنہ یہ ملیّ المیہ ہے کہ محض ناموں اور فروعی اختلافات کی بناء پر ملت اسلامیہ میں تفریق پیدا ہو گئی ہے۔ جس کا حل طریقت نسبت رسولﷺ میں پنہاں ہے۔

فرمایا: یاد رکھئے نسبت رسولﷺ اسلام کی بہت بڑی طاقت ہے اگر مسلمان اس پر قائم ہو جائیں اور باہمی محبت اور یگانگت پیدا کرلیں تو آج بھی دنیا پر چھا سکتے ہیں جیسے صحابہ کرامؓ اپنے زمانے میں چند سالوں میں چھا گئے تھے اور یہ اپنی موجودہ زبوں حالی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

آخر میں غوث المعظمؒ نے جذبے سے فرمایا: ہوسکتا ہے کہ آئندہ عرس شریف کے موقع پر آپ مجھے نہ دیکھ سکیں۔ (یہ سن کر تمام حاضرین پر رقت طاری ہوگئی اور اسی رقت کے لمحات میں آخری دعا فرمائی)۔

غوث المعظم رہبر اعظم طریقت نسبت رسولﷺ اعلی حضرت پیر نظیر احمدؒ المعروف بہ سرکار موہڑوی کا وصال شریف 22 جولائی 1960ء بروز جمعۃ المبارک C.M.H راولپنڈی میں ہوا۔ چنانچہ مندرجہ بالا خطبہ حقیقت میں الوداعی خطبہ ثابت ہوا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس آخری عرس شریف میں جو نشست گاہ قرار پائی تھی بالکل وہی آخری آرام گاہ میں تبدیل ہوگئی۔

مزار اقدس موہڑہ شریف میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

هرگز نه میرد آنکه دلش زنده شد بعشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

☆

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدﷺ سے اُجالا کر دے
(اقبال)

☆

خرد نے کہہ بھی دیا لَآ اِلٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں
(اقبال)